رنگِ خلش



رنگِ خلش

[illegible]

کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کے حسین لمحے
بھی خلش کی نذر ہوجاتے ہیں اور ہم جوں جوں اس احساس کو من کے
اندر گہرائیوں میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو خلش کے بے حساب رنگوں
کی پردہ کشائی ہمیں مضطرب کرنے لگتی ہے اور مکافاتِ عمل کا کبھی نہ ختم ہونے والا
سلسلہ شروع ہوجاتا ہے... گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا... سزا تو لازم و ملزوم ہے۔ اس
کے باوجود اسیرِ شجر سے گہرا ربط و تعلق رکھنا دوا بھی ہے اور عبادت
و ریاضت بھی ہے، نشاطِ وصل بھی اور وجدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں
دستک کو تیرا ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو

حسنات علی رضا فری پیریڈ میں اپنے آفس میں بیٹھے سوچے جارہے تھے کیونکہ آج اماں جان نے آخری وارننگ جو دے ڈالی تھی کہ وہ بہت جلد اپنی ہونے والی شریکِ حیات کے متعلق فیصلہ سنادے تو اس میں انہی کی بہتری ہے۔ ورنہ وہ خود گھر سے نکل پڑیں گی یہ بیڑا اٹھائے کہ ڈاکٹر حسنات علی رضا کے لیے ایک عدد رشتے کی تلاش ہے۔ حاجت مند کی عمر ہے چالیس کے پیٹے میں مگر بتاؤں گی میں پینتیس سال۔'' وہ ماں کی کہی ہوئی بات پر مسکرائے کہ یہ مائیں کتنی معصوم ہوتی ہیں۔ ''ہاں تو اور کیا آخر کو میرے اس ہائی کوالیفائیڈ خوبرو جوان کا تعلق کھاتے پیتے ویل ایجوکیٹڈ گھرانے سے جو ہے۔'' ایف 6 میں مقیم یہ خاندان خالص پنڈی وال تھا جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اسلام آباد شہر بنانے کا ارادہ کیا تو اسی امیدوار کے پردادا نے جی 6 اور ایف 6 میں کوڑیوں کے عوض اپنے تمام بیٹوں کے لیے پلاٹس خرید کر نہایت دانش مندی اور دوراندیشی کا ایسا ثبوت دیا کہ اگلی نسل کے وارے نیارے ہوگئے۔ اور یہ صاحبزادے بھی انہی خوش نصیبوں میں سے ایک تھے۔ موصوف شادی تو ماں کی خوشی کی خاطر کرنا چاہ ہی رہے تھے مگر ابھی تک نظرِ انتخاب کسی پر ٹھہری نہیں تھی۔

''حسنات علی رضا اب تمہارا چھٹکارا نہیں۔ ہوش میں آجاؤ اور اپنی پسند کی لڑکی کی اپنے آس پاس ہی ڈھونڈ لو، ایمرجنسی ڈیکلئر ہوچکی ہے، عمر بڑھتی جارہی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ اماں بھی خفا ہی سدھار جائیں گی اور مستقبل بھی تابناک نہیں رہے گا۔'' اپنے دل کی آواز پر وہ کچھ سوچتے ہوئے مسکرائے۔ ''ماں جی سے کچھ بعید نہیں۔ مجھے کان سے پکڑ کر کہیں کہ بولو اب جو بھی اور جیسی بھی ہے کی بنیاد پر قبول کرلو۔ میں تو مارا ہی جاؤں گا کیونکہ ماں کو انکار تو کر نہیں سکتا۔ اپنی ضد منوانے اور جنت گنوانے کا سودا مجھے منظور نہیں۔'' چہرے پر ہلکی سی تمسخرانہ مسکان پھیلی ہوئی تھی۔ اسی اثنا آفس بوائے کافی کی پیالی ٹیبل پر رکھ کر انہیں حیرت سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ جب سے انہوں نے اس یونیورسٹی کو جوائن کیا تھا۔ چہرے پر کبھی مسکراہٹ تو کیا اس کی ہلکی سی جھلک دیکھنی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت کتابوں اور کمپیوٹر میں ہی گم پایا تھا۔ ان کا خمیر ہی رعب و دبدبے سے جو اٹھایا گیا تھا۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرسکتا تھا۔

''آج ضرور کوئی خاص بات ہے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔ حسنات نے کافی کی پیالی اٹھائی اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر باہر لان میں بینچوں اور گھاس پر بیٹھے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کافی کا سپ لیا۔ سائرہ بانو انہی کی آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ چند کولیگز کے ساتھ گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھی اسکریبل کھیل رہی تھی۔ باتونی ہونے کی وجہ سے اب بھی اس کی زبان چل رہی تھی۔

''چراغ تلے اندھیرا......'' وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑائے اور وہیں کھڑے کافی پینے لگے۔ آج کافی کی کڑواہٹ میں شہد کی گھلاوٹ تھی اور دل ودماغ مسرت وانبساط میں جھوم اٹھا تھا۔

''اب اماں جان کو خوشخبری سنا کر قدرے دھیما کرنے میں کامیاب ہونے کے امکان روشن ہوچکے ہیں لیکن اماں اور خاندان بھر کو یہ سن کر حیرت ضرور ہوگی کہ جس نے زندگی میں کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا......اب اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرلیا؟ اپنی پسند کہاں سے اور کیسے ڈھونڈ لی؟ کون یقین کرے گا، سب مذاق سمجھ کر ٹال دیں گے۔'' وہ سوچتے ہوئے واپس آکر اپنی چیئر پر بیٹھ کر ٹیک لگائے سائرہ بانو کے بارے میں سوچنے لگے۔ ''میرا فیصلہ جلد بازی میں غلط تو نہیں۔'' اب چہرے پر فکرمندی کے آثار ہویدا تھے۔ وہ پھر اٹھے اور کھڑکی میں کھڑے ہوکر سائرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی دیگر اسٹوڈنٹس حمیرا اور آمنہ کا جائزہ لینے لگے۔ تھوڑے توقف کے بعد قلب وذہن نے سائرہ بانو کے لیے پسندیدگی کا الارم دے دیا تو پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر

آئے۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور ہاتھوں میں لرزش آگئی۔

''مائی گاڈ، سوڈیفیکلٹ...... جناب والا ذرا اور گہرائی میں سوچ لو، کہیں عمر بھر کے لیے قیدی بن کر اپنی اس آزادی کو کھونہ دینا۔ آزادی اس اسیری سے ہزار ہا درجے بہتر ہے۔ چاہے اس میں تنہائی ہی کیوں نہ ہو! اس کا اپنا ہی ایک حسین روپ ہے۔'' وہ واپس کرسی پر بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے سائرہ بانو کے بارے میں سوچنے لگے۔ اگلے دن پھر وہ دیر تک کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے اور سوچتے رہے۔ جونہی فیصلہ کرتے اگلے لمحے بدک جاتے۔ وجہ عمر میں تفاوت تو ہرگز نہیں تھی بلکہ اپنی آزادی پر کمپرومائز کرنا گوارا نہیں تھا۔

آج پھر عالمِ تذبذب میں گلاس ونڈو کا بلائنڈ سرکا کر باہر فکرمندانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ یونیورسٹی کے لان میں گھاس پر لڑکیوں اور لڑکوں کا وہی گروپ.. اسکریبل کھیلنے میں مصروف تھا۔ ہر لفظ کے بعد فضا میں ان کی نعرے بازی سے جلترنگ بکھر جاتا تھا۔ اور پھر اگلا ورڈ بنانے کی کاوش میں خاموشی چھا جاتی۔ گیم کے آخر میں حسبِ معمول سائرہ بانو نے اپنی جیت کا اعلان کیا۔

''آئی ایم دی ونر...... سائرہ یو آر ٹو مچ......تمہارا تو جواب نہیں۔'' اس نے اپنے آپ کو سراہتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ ''اوکے گائز اٹس ٹائم ٹو لیو فار کلاس۔'' وہ اپنی رسٹ واچ.. پر نظر ڈالتے ہی کھڑی ہوگئی۔ اور وہ سب بھی سرعت سے کلاس روم کی جانب بڑھ گئے۔ ان کے آفس کے پاس سے گزرتے ہوئے سائرہ نے محسوس کیا کہ سر حسنات کھڑکی میں خاموشی سے کھڑے ان کی تمام ایکٹیویٹیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ سرتاپا ان کے رعب اور جلال کے خوف سے لرز گئی......اور قدموں میں تیزی آگئی۔ وہ سخت مزاج، کم گو اور تنک چڑھے مشہور ہونے کی وجہ سے سب کے لیے کسی اذیت ناک امتحان سے کم نہیں تھے۔ بزنس مینجمنٹ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری NYU سے حاصل کرنے کے بعد انگلش لٹریچر میں بھی واشنگٹن یونیورسٹی سے امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی......پھر غالب، دانش، فیض، اقبال اور اردو کے مایہ ناز ادبا اور شعرا نے ایسا متاثر کیا کہ اردو لٹریچر میں بھی ڈگری لے بیٹھے۔

انہیں پانچ زبانوں پر ایسا عبور حاصل تھا جیسے پیدائشی اور رہائشی ہی وہاں کے ہوں۔ حُب الوطنی کے جذبے سے سرشار اپنی قوم کے بچوں کو تعلیم دینے کی غرض اور جدید طریقوں سے روشناس کرانے کی چاہ میں پاکستان آکر مقامی یونیورسٹی جوائن کرلی۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے چند ماہ میں اس حقیقت کو پالیا تھا کہ اس ماحول کے ٹیم ورک میں ان کی شنوائی ہونے والی نہیں۔ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہونے کے باوجود۔ انہیں وائس چانسلر نے انقلابی ہونے کا خطاب دے کر ایک سائڈ پر کرڈالا تھا۔ اس لیے وہ اس یونیورسٹی کی پالیسی بدلنے میں تو ناکام رہے لیکن انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اپنے اسٹوڈنٹس کی طرف مبذول کردی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ڈیپارٹمنٹ کے رزلٹ خاصے تسلی بخش ہوچکے تھے۔ چونکہ سائرہ بانو ذہانت وفطانت کے لحاظ سے ان کی ٹکر کی تھی۔ ان سے کسی بھی موضوع پر ڈسکشن کرتے ہوئے خوف زدہ نہ ہوتی۔ جبھی وہ ان کی فیورٹ اسٹوڈنٹ بن چکی تھی۔ اسکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹی تک ان گنت ٹرافیز، سرٹیفکیٹس اور شیلڈز نے نہ صرف سائرہ بانو کی عزت وتکریم میں اضافہ کیا تھا بلکہ ان کے ڈیپارٹمنٹ کی بھی اچھی خاصی عزت افزائی ہوئی تھی۔

اپنی بے لوث محنت سے اپنا لوہا منوانے کے بعد حسنات علی نے اس یونیورسٹی میں اپنا مقام اپنی پسند کے مطابق حاصل کرلیا تھا۔

جب ماں نے انہیں شادی کرنے پر مجبور کرنا شروع کیا تو ان کے قیمتی لمحات سوچ وبچار میں گزرنے

کی راہنمائی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے لیے وہ اور کچھ نہیں تھے۔ وہ جانتی تھی مزاجاً بھی زمین... آسمان کا فرق تھا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آسمان پر ان کا جوڑا بنا ڈالا تھا۔ اب وہ یونیورسٹی سے بھی فارغ ہو گئی تھی۔ والدین کا آگے پڑھانے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے آنکھوں پر ایمان کی پٹی باندھ کر فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔ اپنے رب کے فیصلے پر راضی بہ رضا ہو کر سب نے خوشی، خوشی اس رشتے کو آئیڈیل سمجھ کر دعائے خیر پڑھی اور ایک مہینے کے بعد سائرہ بانو نے حسنات علی کی خاموش، تنہا اور ہر جذبے سے عاری زندگی میں ہلچل مچا دی۔ شروع کے چند دن بچے کے شوق کے مانند گزر گئے جو نیا کھلونا پا کر وقتی طور پر بے پناہ خوش ہوتا ہے کہ یک دم حسنات کو محسوس ہوا کہ ان کی ذاتی زندگی کے ہر لمحے پر سائرہ قابض ہو چکی ہے ان کی آزادانہ اور خود مختارانہ زندگی... پابندیوں کی زد میں جا چھپی ہے۔ شادی کے چند دنوں بعد ہی انہوں نے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا تھا۔ سائرہ کا اس وقت مزید کچھ بھی پڑھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ فی الحال وہ اپنی زندگی کو پڑھائی سے نہیں بلکہ فراغت سے انجوائے کرنا چاہ رہی تھی۔

☆☆☆

''آپ نے ہنی مون کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' سائرہ ان کی اسٹڈی میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر کچھ جھجکتے ہوئی بولی مگر انہوں نے کمپیوٹر سے نظریں ہی نہ اٹھائیں۔

''حسنات میں آپ سے بات کر رہی ہوں، شادی ہوئے دو ہفتے ہو گئے ہیں، آپ نے تمام چھٹیاں اسی اسٹڈی کی نذر کر دیں۔ کیا یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی پروگرام نہیں؟'' وہ پھر متذبذب لہجے میں بولی۔ ''کیا چند دنوں میں ہی شادی کا نشہ اتر گیا ہے حسنات... بندشِ ابدی نہ ہو تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ رشتہ ہی انسیت ولگاؤ کا ہے نہ کہ غیریت کا۔''

''ہاں یہ تو ہے مگر اب ہمیں واپس اپنی روٹین پر آ جانا چاہیے۔ یار محبت کے سوا اور بھی تو بہت سے جھمیلوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ انہیں بھی تو ساتھ لے کر چلنا ہے۔'' وہ کمپیوٹر سے نظریں ہٹائے بغیر بڑی رکھائی سے بولے تو سائرہ ایک دم سے ہراساں و پریشان انہیں دیکھنے لگی۔

''کیا شادی اسے کہتے ہیں..... بورنگ اینڈ سو بورنگ۔'' وہ بڑبڑائی۔

''میں نے کچھ غلط نہیں کہا، تمہاری ادھوری تعلیم تمہاری توجہ کی منتظر ہے، شادی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تعلیم کو مکمل کیے بغیر ہی خیر باد کہہ دو۔ شادی دو باہوش انسانوں کے مل جل کر رہنے کا نام ہے، بہت عام اور نازک سا رشتہ ہے یہ..... اگر ایسا نہ ہوتا تو پل بھر میں ٹوٹ نہ جاتا۔ اس لیے بہتر ہے. ہم دونوں کے لیے کہ شخصی آزادی... برقرار رہے۔ اس میں گلیمر اور انجوائے منٹ اپنی، اپنی آزادی میں ہی ہے۔'' وہ نرم لہجے میں بولے۔

''دیکھو میں تمہاری زندگی کو پابند نہیں کروں گا۔ تم میرے کام اور مشغلوں میں دخل اندازی نہیں کرو گی۔'' سائرہ خفیف سی ہو کر نظریں جھکا کر بیٹھ گئی اور وہ سنجیدگی سے ڈاکومنٹری کی طرف متوجہ ہو گئے..... سائرہ کے جذبات کی پروا کیے بغیر ان کے چہرے پر بے انتہا سکون تھا جیسے ان کی باتوں میں بھرپور چاشنی ہو..... سائرہ کے اعصاب مشتعل سے ہو کر رہ گئے۔

''حسنات کمپیوٹر آف کر کے میری بات پر توجہ تو دیں۔ کل ہی آپ کی بڑی بھابی بتا رہی تھیں کہ وہ شادی کے چوتھے دن ورلڈ ٹور پر نکل گئے تھے۔'' وہ اب تھوڑا رقت آمیزی سے بولی تھی۔

''اچھا تو یہ بتاؤ کہ منجھلی بھابی نے کیا رپورٹ دی اور چھوٹی بھابی اور میری بہنوں نے کیا پٹی پڑھائی ہے؟

یہ سب کی سب بہت جاہل خواتین ہیں جنہوں نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا ہے، تم نے بھی ان کی شراکت اختیار کرلی تو مجھے تمہاری ذہانت پر شک ہونے لگے گا اور اپنے فیصلے پر پچھتاوا۔'' حسنات کے سخت الفاظ سن کر اسے ایسے لگا جیسے اس کی زبان میں تاب و طاقت ہی نہیں رہی ہو...... آنکھیں ندامت کے مارے جھک گئیں اور وہ ہونٹوں کو دانتوں سے دبانے لگی۔ اس کے اندر ایک توڑ پھوڑ جاری تھی۔ کافی دیر خاموشی طاری رہی۔ وہ رعونت سے بھرپور اگلی جھاڑ کا انتظار کرنے لگی جبکہ چہرے کا رنگ تو متغیر ہو چکا تھا۔

حسنات کی بارعب آواز نے ارتکاز کا لمحہ توڑا۔ تو ایک دم سے سوچتے ہوئے چونک کر اچھلی اور ذہن ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت خوب صورت ذہن بخشا ہے، ان فضولیات میں اسے باؤنڈ نہ کرلینا۔ اسے کھلا اور آزاد رکھو تاکہ زندگی کے تمام حسن کا سلسلہ قائم و دائم رہے...... اگر تمہاری ایسی بچگانہ سوچ رہی تو پھر تو سلسلہ منقطع ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ ہماری لڑکیوں کا مسئلہ ہی یہی ہے کہ رٹو طوطا بن کر ڈگریاں حاصل کرلیں...... استعمال کا سلیقہ تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔''

''سیر و سیاحت بھی تو ذہن کو وسیع کرتی ہے، مجھے پیرس دیکھنے کا بہت شوق ہے، وہاں کا پروگرام بنائیں ناں ایک تیر سے دو شکار سیاحت بھی اور معلومات بھی۔ آپ نے تو پڑھا ہی ہوگا کہ وہاں کی ہسٹری اور آرٹ کا تو جواب نہیں۔'' اس نے نرم لہجے میں جیسے خواہش کا اظہار بھی کیا اور خوشامدانہ احتجاج بھی کر ڈالا۔

''نیزہ بازی کی کوئی ضرورت نہیں، کیا وقت ضائع کرنے کے مشورے دے رہی ہو، پیرس کیا کوئی بھی جگہ دیکھنے کی چنداں ضرورت نہیں، بک ریڈنگ سے انفارمیشن لو، کمپیوٹر کس لیے ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ گھر بیٹھے بیٹھے۔ اور سیر و تفریح کی سائیٹ میں بھی جاؤ۔ بہت کچھ موجود ہے۔'' وہ خوش مزاجی سے بولنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ بات سن کر اس کا جی چاہا سر پیٹ لے اور بال نوچ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

''وہ تو آپ نے درست فرمایا ہے بہانہ تو ہنی مون منانے کا ہے، اس کے پس پردہ بہت کچھ ہے، ایک دوسرے کے مزاج سے آگاہی اور بہت کچھ......'' وہ بھی قدرے شگفتہ لہجے میں بولی۔ حالانکہ دل لرز رہا تھا۔

''یعنی بدقسمتی سے مڈل کلاس کے لوگوں کا بھی شعور مغربی سانچے میں ڈھل چکا ہے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے، باقی مانوسیت تو سراسر دردِ سر ہے۔ تم کن اذیتوں کا سودا کرنے چل پڑی ہو۔'' وہ طنزیہ مسکرا کر بولے تو وہ جھینپ گئی۔ ان کے بے رحمانہ رویے پر صابر رہنے پر اکتفا کا سوچ کر اس کی لائٹ براؤن حسین آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ خود پر قابو پاتے ہوئے اسے لگا جیسے اس نے سر پتھر سے ٹکرا کر شدید زخمی کرلیا ہے۔ آخر اس نے اس نرالے اور انوکھے خیالات رکھنے والے انسان کے سامنے خاموشی ہی میں عافیت جانی...... جو انسان بیوی سے غیریت سے بھرپور زندگی رکھنے کا خواہشمند ہے اس کا اللہ ہی مالک ہے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اسٹڈی کی ہزاروں کتابوں پر جارحانہ نظر... ڈالتی ہوئی وہاں سے ملحقہ اپنے بیڈروم میں جا کر بستر پر سیدھی لیٹ گئی۔

''مجھے آج حسنات کا انکار کرنا اتنا ناگوار کیوں گزر رہا ہے، وہ تو پہلے دن سے ہی رومانس سے عاری انسان ہیں۔'' عمروں کا فرق سوچ و خیالات پر بری طرح حاوی ہوگیا تھا۔ ''حالانکہ حسنات نے شادی سے پہلے کون سا مجھے خوشیوں بھرے سبز باغ دکھائے تھے نہ ہی محبت و چاہت سے مغلوب ہو کر وعدے وعید کیے...... نہ ہی آسمان سے تارے توڑ کر مانگ بھرنے کی بات کی...... پھر میرا دل اس درجہ شکستگی، افسردگی اور مایوسی میں کیوں گرفتار ہوگیا۔ میں ہی نکاح کے دو بول پڑھ کر ان پر فریفتہ ہوگئی۔ طوعاً و کرہاً جس کا جواب انہیں دینا پڑا تھا۔'' وہ

یہ سوچ کر اپنے آنسوؤں پر قابو پانے لگی۔ ''اگر یہ مزاج تھا ایسے ارادے تھے، ایسی ظالمانہ سوچ تھی، ایسا یخ بستہ رویّہ روا رکھنا تھا تو بھلا شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ آپ کا تو کچھ نہیں بگڑا۔ میرا سائبان جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی۔ کیسا مضبوط اور پختہ تھا۔ آپ نے میرے اس اٹوٹ سہارے کی بنیادیں ہلا دیں۔ اب مجھے وہاں کون خوشی سے واپس ویلکم کہنے کے لیے تیار ہوگا۔ اب کوئی نہیں پہچانے گا اور نہ ہی ہمدردی کے دو بول سے مجھے طمانیت بخشے گا۔ بس اب یہی میرا ٹھکانا ہے، جہاں دلہن بن کر آئی تھی یہاں سے کفن کی پردہ داری میں لحد میں اتاری جاؤں گی۔'' وہ خود کلامی کرتی رہی۔ آنسو تکیہ بھگونے میں پیش پیش تھے۔ حسنات نے کمرے میں جھانکنے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ کمرے میں شام اتر آئی تھی جو آہستہ آہستہ سرمئی ہوتی تاریکی کا روپ دھارتی چلی گئی اور وہ اسی کیفیت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی قسمت کی لکھت کو بدلنے کا سوچتی چلی گئی مگر کوئی راہ سجھائی نہ دی تو دل کو یہ کہہ کر تسلی دینے لگی ابھی نئی نئی بات ہے، نیا نیا تعلق جڑا ہے نہ ہی انڈر اسٹینڈنگ ہے، اتنی ٹینشن لینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں ہی طبعاً بہت جذباتی ہوں، حسنات دھیمے مزاج کے انسان ہیں، امید ہے وقت کے ساتھ میرے رنگ میں ضرور ڈھل جائیں گے۔ امی کا تو یہی کہنا تھا۔''

☆☆☆

''بیٹا! کچھ یاد ہے کہ بھول گئے، میں ایک ہفتے سے یاد دہانی کرا رہی ہوں کہ سائرہ کی سالگرہ ہے، منانی بہت ضروری ہے، وہ کیا سوچے گی کہ کس قدر بے حس اور روکھا خاوند ہے کہ اس کی خوشی کی رتی بھر پروا نہیں۔ نہ ہی تم ہنی مون کے لیے تیار ہوئے۔ نہ آج تک اسے باہر ڈنر پر لے گئے۔ تمہاری روٹین میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی چھڑوں والی آزادانہ حرکتیں اور باتیں۔ خدا کے لیے اس کے لیے کچھ وقت نکالو۔ مجھے ڈر ہے، سائرہ کہیں تمہیں چھوڑ کر میکے ہی نہ چلی جائے۔ پہلے ہی سب تمہاری شادی کی مخالفت کر رہے تھے اب مجھے طعنے و تشنے مت سنوانا۔'' ماں نے اسٹڈی میں داخل ہوتے ہی اپنی فکرمندی کا اظہار کیا وہ حیرت سے انہیں دیکھ کر بولے۔

''بڑی عجیب دھمکی دی ہے آپ نے...... سائرہ بانو پاگل یا بے وقوف نہیں۔ بھلا وہ میکے کیوں جائے گی اماں جان، میں نے اسے ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے، گھومے پھرے، جہاں جانا چاہتی ہے بصد شوق جائے، ڈرائیور ہر وقت موجود ہوتا ہے، سیاہ و سفید کی مالک ہے وہ یا بنی بیٹیوں کی زندگی ملاحظہ فرمائیں کہ اپنے اُن متلون مزاج شوہروں کی خوشامدیں اور تعریفیں کرتے نہیں تھکتیں جبکہ انہیں اس گھر تک آنے کی اجازت نہیں تو سوچیں کہ کسی اور جگہ سائرہ کی طرح منہ اٹھائے جاسکتی ہیں؟ وہ سائرہ کی زندگی پر رشک کرتی ہیں، سو فیصد محتاج ہیں اپنے شوہروں کی جبکہ سائرہ خود مختار ہے ہر لحاظ سے۔ میں نے بینک کا تمام حساب کتاب لین دین اسی کے سپرد کردیا ہے۔ نہ میری طرف سے اعتراض ہے نہ ہی کوئی حساب کتاب... اب آپ بتائیں کہ اسے اور کیا چاہیے۔ جس عورت کے پاس آزادی اور پیسہ ہو، اسے تو مرتے دم تک اپنے شوہر کا احسان مند ہونا چاہیے۔ نا کہ ہر وقت خفگی اور بیزاری کا اظہار کرتے رہنا۔ میں بھی جانتا ہوں بہت اچھی طرح کہ اس معاشرے کا مرد ان دو قوتوں کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ یہی اس کی طاقت ہے، بیوی کو قابو میں رکھنے کی اور اپنی دل جوئی کرانے کی۔ میری تو ایسا کرنے کی نیت ہے نہ ہی میری اس سے کوئی ڈیمانڈ ہے۔ اماں میں نے اس پر ایسا ستم تو نہیں کیا مجھے اس کا بہت خیال رہتا ہے کہ میری طرف سے کوئی کمی نہ ہو۔ آخر کو میں بھی تو جوابدہ ہوں۔'' وہ کتاب ایک طرف رکھ کر طولانی تمہید سے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ماں

اِک عورت ہونے کے ناتے بے چین اور پریشان نظر آ رہی تھیں۔ سمجھانے کے انداز میں بولیں۔

”بیٹا ان دو طاقتوں کے ساتھ اپنے ہم سفر کی توجہ و پیار بھی تو چاہیے ہوتا ہے ناں..... جس کے سائے میں جھونپڑی بھی محل معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور بھوک و پیاس میں مَن و سلویٰ کا سا احساس تسکین بخشنے لگتا ہے۔ تمہاری حرکتیں مجھے بالکل پسند نہیں۔ خدا کے لیے خود کو بدلنے کی کوشش کرو۔ تم تو میرے بہت تابعدار بچے ہو۔ میری بات پر غور ضرور کرو گے۔“

”اماں جان! امید ہے کہ اب آپ کو میرے شادی سے انکار کی وجہ سمجھ آ گئی ہوگی۔ میں ہر بار آپ کو اپنی تمام مجبوریاں بیان کر کے منا لیتا تھا مگر اگلے روز پھر وہی رونا دھونا۔ اماں میرے پاس چاؤ چونچلے کرنے کا وقت ہی کہاں ہے؟ صبح آٹھ بجے یونیورسٹی جاتا ہوں۔ ساڑھے چھ بجے واپس آ کر کچھ وقت تو میرا اپنا ہونا چاہیے ناں۔ پرائم ٹائم تو یونیورسٹی پر قربان کر آتا ہوں، ان چند گھنٹوں پر میرا بھی تو حق ہے ناں.....“ وہ ماں کے بازو دباتے ہوئے بولے۔

”تم کتنے بجے سوتے ہو؟ تمہارا نہ کوئی آرام کا ٹائم ہے نہ ہی کھانے پینے کا۔ بچاری میری بہو اکیلے ہی کھانا کھاتی ہے اور رات بھر تمہارے انتظار میں کروٹیں بدلتے ہی گزارتی ہوگی۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو دنیا میں تمہاری اس بے پروائی و بے اعتنائی کا ڈھنڈورا پیٹ چکی ہوتی۔ وہ تو بڑی ہی صابر و شاکر لڑکی نکلی، عقلمند ماں کی بیٹی ہے، ورنہ تم یا نہ ہی رکھتے تمام عمر کہ تمہارے ساتھ ہوا کیا ہے۔“ اماں جی اسٹک کے سہارے کھڑی ہو گئیں۔

”اچھا ہوتا اگر اپنی بیوی کو ڈنر کے لیے لے جاتے۔ موسم بھی بہت خوشگوار ہے اور موقع بھی ہے۔“ وہ آہ بھر کر مزید بولیں۔ ”کسی کی بیٹی لا کر میں نے بہت بڑی غلطی کر دی۔ سوچا تھا کہ تم بیوی کے آنے سے ان نامراد کتابوں کی جان چھوڑ دو گے۔ یہ کوئی زندگی ہے جو تم جی رہے ہو، دل دُکھ جاتا ہے میرا۔“

”میری پیاری اماں یہی تو اصل اور حقیقی زندگی ہے، گھر بیٹھے بٹھائے دنیا کی اور آسمان و ستاروں کی سیر کرو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ”وہ مجھے جوائن کیوں نہیں کر لیتی۔“

”رہنے دو بابا گھر میں ایک پاگل کافی ہے۔“ وہ نخوت سے بولیں۔ ”تمہارے ابا کیا جاہل تھے جو انہوں نے خاندان کے ہر فرد کو وقت دیا۔ میرے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ یہی اسٹڈی جس میں تم بیٹھے ہو ان کی تھی۔ خوب آباد تھی۔ ہر آنے جانے والے کے لیے اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا مگر اب کسی چیونٹی کی بھی جرأت نہیں اندر آنے کی گستاخی کر جائے۔“ یہ سن کر حسنات کو دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ کیونکہ انہیں خود پر اسی سلوک و رویے کا زعم تھا کہ انہیں اسے کسی کی پروا ہے ضرورت ہے نہ ہی محتاجی ہے۔ ان کا اپنا وقت اور اپنی پسند کے مطابق گزرتی ہوئی زندگی قابلِ رشک ہے اور ان کے لیے قابلِ تسکین بھی۔ اماں جان ہولے ہولے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

اسی اثنا میں سائرہ کے میکے والے کیک اور بے شمار تحائف کے ساتھ گھر میں وارد ہوئے تو ان کے اس طرح اچانک اور بے تکلف روپے پر وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے کہ بہت ہی عجیب اور سر پھرے شو باز قسم کے لوگ ہیں کہ ان کے خیال میں ایسے تمام بے ہودہ فنکشنز تو بڑے لوگوں نے اپنے نصیب میں پیسہ صرف کرنے کے لیے خود پر مسلط کر رکھے ہیں۔ سائرہ مڈل کلاس کی لڑکی ہے، انہیں یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ ابھی اسی سوچ و بچار میں محو تھے کہ سائرہ چہکتی ہوئی اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ اس نے سفید شیفون کی کامدانی کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ گلے اور کانوں میں ڈائمنڈ کا زیور اور ہلکے میک اپ میں وہ

غضب ڈھا رہی تھی۔ حسنات نے اس پر حیرت سے بھرپور نگاہ ڈالی۔ اس سے پہلے کہ دونوں کی گفتگو شروع ہوتی اس کی بھابیوں اور کزنز نے دھاوا بھول دیا اور انہوں نے چھیڑ خانیاں کیں تو حسنات کی پیشانی پر ناگوار شکنیں ابھر آئیں۔ سب نے سنڈے برنچ کا پروگرام پی سی کا رکھا تو انہوں نے کئی حیلے بہانوں سے جان چھڑانے کی کوشش کی حالانکہ انہوں نے اپنے خاندان میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کو ایسی تمام ایکٹویٹیز میں... بھرپور حصہ لیتے دیکھا تھا۔ مگر وہ ہر وقت اپنی مصروفیت اور وقت کی کمی کا بہانہ بنا کر ان کے ہر پروگرام سے کنارہ کشی اختیار کر جاتے تھے۔ وہ زندگی کی ان دلچسپیوں اور چھوٹی موٹی خوشیوں کو بے ہودگیوں کا نام دیا کرتے تھے اس لیے زندگی کے ان ہنگاموں سے انہیں نہ تو لگاؤ تھا نہ ہی وہ کوئی سروکار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ زندگی کو نہایت بنیادی، آسان اور سہل اصولوں پر گزارنے کے تمنائی تھے۔ سائرہ بانو انہیں تمام لڑکیوں سے مختلف لگی تھی۔ جسے انہوں نے کتابوں میں گم پایا تھا۔ گولڈ میڈلسٹ ہونے کا اعزاز بھی اسے حاصل تھا جو اس بات کی تصدیق تھی کہ وہ بھی اپنا وقت کسی بیکار کے مشاغل میں ضائع کرنے والی لڑکی نہیں بلکہ اس کی سوچ کا محور بھی کتابیں ہی ہیں وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا اسے منتخب کر بیٹھے تھے۔

سائرہ پر اگرچہ ان کی جانب سے کوئی روک ٹوک نہیں تھی پھر بھی برتھ ڈے کا پروگرام شوہر کے بغیر اسے... بالکل مناسب نہ لگا تو وہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی۔ بہنوں اور سہیلیوں نے جی بھر کر چھیڑا اسے طیش دلایا۔ اس نے ان کے زور دینے پر حسنات سے ضد کی مصنوعی طور پر رونا دھونا بھی ڈالا۔ دوسروں کے سامنے احساسِ ندامت کا اظہار بھی کیا مگر سب حسنات کے لیے بچپنا اور اس کا لاابالی پن تھا۔ بھلا وہ اس کا حصہ کیونکر بنتے۔ اس وقت تو بات ٹل گئی تھی۔ اب نئی نویلی دلہن ہر شام ایک نئی پیشکش گوش گزار دیتی اور وہ تلملا کر رہ جاتے۔ آخر ایک رات اسے دو ٹوک لفظوں میں اپنا فیصلہ سنایا۔

میں تمہاری ان بے جا خواہشات کے ساتھ دو گام بھی نہیں چل سکتا۔ ایسی ڈیمانڈ جس میں وقت کا زیاں ہو، وہ میں پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ بہتر ہے کہ خود کو مصروف رکھو اور اب پی ایچ ڈی کر کے ایک باعزت اور بامقصد زندگی گزارنے کا پروگرام بناؤ۔ ہماری اسی ذہنی ہم آہنگی اور مطابقت میں زندگی بہت حسین اور پُرسکون طریقوں سے گزر جائے گی۔“ ان کی یہ باتیں سن کر وہ بڑی متحمل مزاجی سے گویا ہوئی۔

”میں اس مشورے کی تہ دل سے قدر کرتی ہوں مگر اس وقت مجھے طویل پڑھائی کے بعد آرام کی اشد ضرورت ہے۔ مجھے ری لیکس ہونے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ پھر مجھے فیملی ریز کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ میری تمام سوچ کا محور نکاح کے بعد بدل چکا ہے۔ اب میرا دل اِک وفا شعار بیوی کا ہے، اس وقت میرا گھر، میرا شوہر، میری سسرال کا ہر رشتہ میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس کے بعد بچوں کی پیدائش اور ان کی پرورش میرے تمام فرائض میں سرِفہرست ہوگی۔ مجھے بچوں سے والہانہ لگاؤ بھی حد درجے کا ہے۔ فیملی کمپلیٹ کرنے کے بعد اور... باقی بھی تمام گھریلو ذمے اور فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد تو وقت کا ہر لمحہ میرا اپنا ہوگا۔ اسے مصرف میں لانے کے لیے میں نے ایک ڈھانچا تشکیل دے رکھا ہے۔ یہ آپ کی ہیڈک نہیں..... آپ بے فکر رہیں، میں اپنی پڑھائی کیونکر ضائع کروں گی۔ مجھے خود بھی تو احساس ہے۔“ وہ رسانیت اور سنجیدگی سے کہہ کر کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ ”میرا خیال ہے اب سو جانا چاہیے۔ یہ ڈسکشن پھر کبھی سہی۔“

”بیگم کل کس نے دیکھی..... آج کی بات کل پر کیوں چھوڑیں؟ ویسے بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تم نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا..... کیسی جاہلانہ باتیں کرتی ہو، کم از کم مجھے تم سے ایسی احمقانہ منطق کی توقع تو ہرگز نہیں تھی۔“

وہ رکھائی سے بولے۔ ”تم تو میری بھابیوں اور بہنوں جیسی اِک عام عورت ہی نکلیں۔ کہاں گئی تمہاری تعلیم اور تمام ٹرافیز اور میڈلز..... ؟ اگر تم نے بچے ہی پیدا کرنے تھے، ملازموں والے کام ہی کرنے تھے تو تعلیم پر اپنا اتنا وقت ضائع کیوں کیا۔ بارہ سال کی عمر میں شادی کرتیں اور تیرہ سال کی عمر میں ایک عدد بچہ پیدا کرچکی ہوتیں۔ مجھے افسوس ہے تمہاری سوچ پر۔“

”مجھے آپ کی کسی بات سے اتفاق نہیں۔“ وہ تلملا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”میرے اندر کی عورت کو اعلیٰ ترین مقام پر کھڑے ہونے کی خواہش کو آپ رد نہیں کرسکتے۔“

”مجھے بھی تمہارے ان خیالات سے اتفاق نہیں۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔ آئی تھنک سائرہ مجھے لگتا ہے کہ ہم ندی کے دو کنارے ہیں، ساتھ چلتے ہوئے بھی بہت دور..... ہم دونوں شاید ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔ تمہیں سمجھنے میں مجھ سے بھول ہوگئی۔“ وہ پژمردہ لہجے میں بولے۔ ”اور تمہیں مجھے جاننے میں غلط فہمی ہوگئی۔ مجھے پارٹنر چاہیے تھا۔ ویل ایجوکیٹڈ..... جو مجھ سے کتابوں کے بارے میں مختلف نظریات کے بارے میں ڈسکشن کرسکتا۔“

”چلیں اس مسئلے کا حل ڈھونڈیں۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”کیونکہ میں تو اِک عام بیوی ہوں، ڈیمانڈنگ..... خود کو بدل نہیں پاؤں گی، قدرتی امر ہے، حل ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ دونوں اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا، کیا جائے؟“ اس کے لہجے میں بے پروائی تھی۔ جیسے یہ بہت معمولی سی بات ہو۔ وہ اپنے ہاتھوں کو بغور دیکھنے لگی۔ جن پر مہندی کی سرخی اور اس کی مہک وقت کی نذر ہوچکی تھی۔ آڑھی ترچھی لکیریں واضح طور پر نظر آرہی تھیں۔ آج اسے اپنی دادی کی باتوں میں کسی قدر سچائی نظر آنے لگی تھی۔ جو عموماً ہر پوتی، نواسی کی شادی پر ایک فقرہ بولنا نہیں بھولتی تھیں کہ شادی تو اِک جوا ہے، جس کی ہار اور جیت کا اندازہ اس میں شامل ہونے سے ہی ہوتا ہے۔ جو جیت گیا اس کے وارے نیارے جو ہار گیا وہ بدقسمت کہلایا۔

”سچ ہے کہ میں بھی جوئے کی نذر ہوگئی۔ میری تمام عمر داؤ پر لگ گئی۔ اور یہ دنیا میرے لیے دوزخ سے بھی بدتر آماجگاہ بن گئی۔ یہ ہیں میرے بخت۔“

☆☆☆

”حسنات آپ میری بات پر غور تو کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمیں جلد از جلد اپنی فیملی کمپلیٹ کرلیں چاہیے تاکہ میں وقت سے فارغ ہوکر اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرسکوں۔ تعلیم میں طویل وقفہ آگیا تو مجھے دوبارہ جوائن کرنے میں بہت مشکل ہوگی۔“ وہ اسٹڈی میں ان کی آرام چیئر کے قریب صوفے پر بیٹھ کر اپنی ہمت کو یکجا کرکے آہستگی سے بولی۔

مگر حسنات کی طرف سے کوئی جواب آیا نہ ہی نظریں کتاب سے اٹھیں۔ سائرہ نے ان کی کتاب پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میں نے آپ سے بہت ضروری بات کی ہے حسنات..... کتاب بند کیجیے اور میری اس خواہش پر غور کیجیے۔ میں غلط نہیں کہہ رہی۔ ایک حقیقت بیان کررہی ہوں، ہر عورت کا اِک حسین خواب ہے یہ۔“ وہ سنجیدگی اور..... سختی سے بولی۔ ”خدا کے لیے میرے خواب پر غور کیجیے۔ کیا ہوگیا ہے آپ کو میری کسی بات کی کوئی وقعت ہی نہیں۔“

”اُف جاہلوں والی حرکتیں ہیں تمہاری، تمہاری ایجوکیشن کاغذ کے چند ٹکڑوں تک ہی محدود ہے۔ جاؤ

نہیں جلا دو، میں مذاق یا طنزاً نہیں کہہ رہا، آئی ایم سیریس..... کیونکہ اس کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“ وہ کتاب بند کرکے توہین آمیز لہجے میں بولے۔ تو وہ اپنی اس ہتک پر انہیں تڑپ کر دیکھنے لگی۔ ان کے چہرے پر نفرت و حقارت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن تھا۔

”جب سے شادی ہوئی ہے میری زندگی ہی بدل گئی۔ نہ رات سونے سے پہلے کتاب پڑھ سکتا ہوں نہ ہی اپنی مرضی سے سوسکتا ہوں نہ جاگ سکتا ہوں، تمہاری پسند کے کپڑے پہنتا ہوں، تمہاری مرضی کے مطابق کھانا کھاتا ہوں، تم نے تو میری زندگی کے ہر لمحے کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ میری سانسیں بھی تمہاری اور میری روح بھی تمہاری۔ میرا تو کچھ نہیں رہا۔ تہی دست ہوگیا ہوں میں۔“ لہجہ زہر آلود تھا۔

”ایسا تو ہرگز نہیں جو آپ نے نقشہ کھینچا ہے۔ آپ تو بیچلر کی طرح بے مہار اور آزاد ہیں حسنات! آپ جیسے ذہین و فطین لوگ نارمل نہیں ہوتے۔ ان کا آئی کیو لیول اِک عام انسان سے بہت ہائی ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی میں کہیں نہ کہیں مار ضرور کھا جاتے ہیں۔ مجھے اب آپ کی مینٹل کنڈیشن کی سمجھ آگئی ہے، کاش حسنات آپ ایک لو آئی کیو لیول کے نارمل انسان ہوتے تو بہتر تھا۔ جسے زندگی کی قدر ہوتی۔ وقت کی اہمیت کا احساس ہوتا تو کتنا ہی اچھا ہوتا حسنات۔“ وہ روہانسی ہوگئی۔ ”اپنے ذہن وقلب کو مطابقت و مفاہمت کا درس سکھائیں۔ آپ کے پاس علم کی کمی نہیں۔“

”بیگم خدا کے لیے اپنی زندگی میں مصروف رہنا سیکھو، اپنی زندگی کو ضائع مت کرو، تمہاری باتوں میں جذباتی پن کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جس نے کتابوں کو اپنا دوست بنالیا اس نے کوہ ہمالیہ سر کرلیا۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر تلخی سے بولے۔ ”مجھے اپنا محتاج بنانے کی کوشش مت کرو۔“

”مجھے اولاد چاہیے حسنات..... میں اپنی زندگی کا مقصد پانے میں کامیاب ہوجاؤں گی۔ میری یہ خواہش جائز ہے کیونکہ عورت چاہے ان پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ، ہر عورت ماں کے مقدس رشتے کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ قدرتی امر ہے، یہ تقدس اور عظمت مجھے سونپ دیجیے پلیز حسنات۔ میری التجا سن لیجیے۔“ وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

”مجھے بچے قطعاً پسند نہیں..... میں نے اپنے لیے اپنے جیسا ساتھی ڈھونڈا تھا۔ تم تو مجھ سے بالکل ہی الگ نکلیں۔ سائرہ میں بچے کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتا۔ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں جو اسے .... دے سکوں گا۔“ وہ سنجیدگی اور تلخی سے بولے۔ ان کی باتیں اسے شدید حیرت میں مبتلا کرگئیں۔

”مجھے تنگ کرنا چھوڑ دو، جاؤ اپنا کام کرو، صفائی کرو، کھانا پکاؤ، کپڑے دھلائی اور استری کرو، یہ ہے ایک گولڈ میڈلسٹ کا رول؟ چلو بھر پانی میں ڈوب مرجانے کا مقام ہے۔ اب بچے پیدا کرنے کی کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس پر تمہارا نہیں صرف میرا اختیار ہے۔ اس کا فیصلہ تو میری زندگی میں نہیں ہوسکتا۔ یہ بات غور سے سن لو اور آئندہ مجھ سے ایسی ڈیمانڈ مت کرنا۔ جو میرا سکون غارت کردے۔“

”اس پر میرے رب کا اختیار ہے، آپ کا ہے نہ ہی میرا۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”جب اس ذات نے حکم کردیا کہ کن فیکون تو آپ اور میں جھٹلانے والے کون ہوتے ہیں۔“

”اللہ تعالیٰ نے انسان کے اختیارات میں بہت کچھ سونپ رکھا ہے، غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے تمہیں۔ آنکھیں بند کیے کنویں میں کودنے کو اختیارات کا نام دینا حماقت اور نادانی ہے، جس میں تم مقید ہوچکی ہو۔“ وہ بھی بے ساختگی سے بولے۔ ”ہماری شادی کو تین سال ہوگئے ہیں۔ رب العزت نے ہمیں اس معاملے میں بااختیار رکھا۔ اس کی مہربانی ہے، مجھے بچے کی چاہ نہیں اور میں نے اپنی تقدیر کا رخ موڑ لیا۔ لکھت

کو مٹا دیا۔ اب دوبارہ کندہ کرنا ناممکن ہے۔ اسی پر راضی ہو جاؤ۔'' یہ سن کر مزید قیل وقال کیے بغیر وہ وہاں سے اٹھی اور تیزی سے اپنے کمرے میں جا کر رکے ہوئے آنسو کھل کر بہانے لگی۔ پچھلے تین سال سے وہ جب بھی اس ٹاپک کو چھیڑتی تھی تو حسنات کا یہی نامناسب ردِعمل ہوتا تھا۔ پانچ منٹ میں پانچ من بھاری تکلیف دہ طعن لعن سے نوازا جاتا۔ حسنات اس کے جانے کے بعد پھر کتاب میں کھو گئے اور وہ دیر تک آنسوؤں سے دل کے آبلوں کا علاج کرنے کی کوشش کرتی رہی اور پھر ایک دن اماں جی بھی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں تو گھر میں کوئی بات کرنے والا نہیں رہا۔ وہ مایوس سی ہو کر رہ گئی تھی۔ حسنات نے کہنا شروع کر دیا تھا۔

''فارغ اور بیکار رہو گی تو تمہارا انجام یہی ہوگا۔ اینگزائیٹی، ڈپریشن اور پھر میڈیسن...... اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ پی ایچ ڈی گھر کے چند کلومیٹر کے فاصلے سے کر لوگی۔ اس سے بڑی اور کیا خوش قسمتی ہوگی تمہاری۔ لوگ اس یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے دور دراز علاقوں سے آتے ہیں۔ تمہارے گھر میں یہ سہولت میسر ہے۔ تم تو حد درجے ناسمجھ اور بے وقوف نکلیں۔ اپنے دماغ پر تالے مت لگاؤ۔ ورنہ پاگل خانے سدھار جاؤ گی۔ میری بات مان جاؤ، تم سے عمر میں بڑا ہوں، تجربات میں بھی پختہ ہوں۔''

وہ اسے کئی راتوں سے جاگتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ یونیورسٹی سے واپس آتے تو اسے بھوکا، پیاسا، بے وقت سویا ہوا پاتے۔ رات کبھی لان میں تو کبھی ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے گزر جاتی۔ نہ پہننے اوڑھنے میں دلچسپی رہی، نہ سہیلیوں کے ساتھ ہلا گلا کرنے کی چاہ رہی۔ گھر کی ہر شے اپنی جگہ سے ہل چکی تھی۔ الماریاں الجھ گئیں، کچن کے برتن گھر بھر میں بکھرے ہوئے تھے، نوکر عیاشی منا رہے تھے، اس تبدیلی کو حسنات نے محسوس تو کیا مگر اسے نظر انداز کر ڈالا تھا۔ انہیں ہمیشہ سے ہی ایسی بے ترتیبی میں رہنے کی عادت تھی۔ انہیں بیڈ روم میں بکھرے ہوئے کپڑے، جوتے اور تکیے، چادریں بے سکون نہ کرتیں۔ باتھ روم میں کاؤنٹر پر بکھری ہوئی اشیا، گیلے تولیے اور گیلا باتھ روم پریشان نہ کرتے۔ اسٹڈی تو الاماں، جہاں الماریوں، شیلفوں اور کارپٹ پر کتابوں، اخباروں اور رسالوں کے بے ترتیب انبار لگے رہتے تھے جنہیں سلیقے اور طریقے سے رکھنا تو درکنار کسی کو چھونے تک کی اجازت نہیں تھی اس لیے سائرہ اسٹڈی میں جھانک کر دیکھتی تک نہیں تھی کیونکہ بے ترتیبی کو ہضم کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ غیر ارادی طور پر بکھرے ہوئے رسالوں اور اخباروں کو اکٹھا کرنے لگتی تو کڑوی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ ایسی خصلتوں والے شوہر کے ساتھ گزارہ کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا مگر اپنی کمٹ منٹ کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ ان کے ساتھ جوانی کے حسین دن کاٹ تو رہی تھی مگر کرب، اذیت اور بے قراری ہمیشہ ہم سفر رہتی تھی پھر بھی اس نے ان سے کنارہ کشی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ اتنی مضطرب رہنے لگی تھی کہ کوشش کے باوجود وہ پڑھائی جاری رکھنے میں ناکام رہی تھی۔ طبیعت میں یاسیت تو رچ بس ہی گئی تھی کتاب اٹھانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ زندگی سے لگاؤ اور دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ جس کا اندازہ حسنات کو وقتی طور پر ہوتا مگر زیادہ پریشانی لاحق نہ ہوتی تھی کیونکہ گہرائی میں سوچنے اور مسئلہ حل کرنے کو اُن کے پاس وقت کی کمی تھی۔ لاشعوری طور پر سائرہ گھر میں بند ہو کر رہ گئی۔ رہی سہی کسر دیگر سسرال والوں کی طرف سے ہر وقت کی جانے والی بچے کی ڈیمانڈ نے پوری کر دی۔ ذہنی طور پر وہ بے حد کمزور اور لاغر ہو گئی تھی۔ جسمانی طور پر بھی مریضہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کی اس حالت پر حسنات کا رویّہ بدلا...... فکر مندی لاحق ہوئی، اس سے لفظی اپنائیت و انسیت کا اظہار کیے بغیر اسپتال لے گئے، یہ معجزہ شاک کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اتنی بڑی تبدیلی پر وہ خوش

ہونے کے بجائے ہراساں و پریشان ہو گئی۔ حسنات کے پاس اس کے لیے تو ایک پل نہیں تھا آج تین گھنٹے اس پر قربان کرنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ لیکن یہ معجزہ کیونکر رونما ہوا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

☆☆☆

''تمہاری تمام رپورٹس آ گئی ہیں، تم جانتی ہو کہ تم نے مجھے کتنا بڑا دھوکا دے ڈالا ہے۔ تم نے ایسا گھناؤنا فریب میرے ساتھ کیوں کیا؟ تب ہی تو میں کہوں کہ تمہارے چہرے پر ہر وقت بارہ کیوں بجے رہتے ہیں؟ مُردنی کیوں چھائی رہتی ہے، میرا شک درست نکلا۔'' وہ جلالی لہجے میں بول رہے تھے، سائرہ نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''معصوم بننے کی ضرورت نہیں......'' حسنات نے آگے بڑھ کر سائڈ ٹیبل کی دراز کھول کر ٹیبلیٹس کا پتا نکالا۔ جس میں سے صرف دو گولیاں کھائی گئی تھیں۔ حسنات نے قہر آلود نظروں سے گھور کر پتا اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ بہ مشکل اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''حسنات میں نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ شاید طبیعت خرابی کی وجہ سے بھول گئی۔ دماغ سے بالکل ہی نکل گیا کہ مجھے میڈیسن میں ناغہ نہیں کرنا۔ او مائی گاڈ، سوری حسنات۔'' وہ مجرمانہ انداز میں بولی۔ ''یہ سوچی سمجھی ترکیب نہیں تھی۔ اِک بھول تھی۔ بھول تو معاف کر سکتے ہیں۔''

''نان سینس...... مجھے تمہاری کسی بات پر یقین نہیں۔ تمہیں بچہ چاہیے تھا، یاد رکھو کہ مجھے دغا اور فریب دے کر تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اسی وقت اٹھو، میرے ساتھ اسپتال چلو۔ اگر میری بات نہیں مانو گی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ ابھی اور اسی وقت۔'' وہ اس کا بازو کھینچتے ہوئے بولے۔

''آپ صبر سے کام لیں، اگر اللہ تعالیٰ ہم پر مہربان ہو ہی گیا ہے تو اس کا شکر ادا کریں نہ کہ ہم ایک معصوم بچے کے قاتل بن کر جہنمی کہلائیں۔ حسنات یہ تو خاص نظرِ کرم ہوئی ہے ہم پر۔'' وہ خوشی دکھی کے ملے جلے جذبات میں بول رہی تھی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ میرا شک درست ہے کہ تم نے جانتے بوجھتے مجھے اندھیرے میں رکھا۔'' وہ نہ جانے اسے کیا کیا سنا رہے تھے۔ غصے سے ان کے منہ سے جھاگ ابل پڑا تھا۔ وہ خوفزدہ ہونے کے بجائے دلیر بن گئی تھی۔

''آپ کے رول کے بغیر یہ کیسے ممکن تھا؟'' وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بولی۔

''مجھے جھانسا دے کر تم ماں نہیں بن سکتیں۔'' وہ زور سے چیخے اور اسے گھسیٹتے بیڈ سے اتار کر بولے۔ ''مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ تم کیوں نہیں سمجھتیں۔''

''مگر مجھے بچہ چاہیے۔'' وہ بھی چیخی تو وہ ڈھل کر پرے ہٹ گئے۔ اس کا یہ روپ انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ تھوڑے توقف کے بعد نہایت ملائمت سے بولے۔

''تم میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو، میں ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں، صرف ایک سال کی مہلت دے دو۔''

''حسنات میں آپ کو بچے کی کسی ذمے داری میں شامل نہیں کروں گی۔ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ مجھ پر نہ سہی اس معصوم پر ہی رحم و ترس کر لیجیے۔ بچے کے معاملے میں آپ کی نفرت اور میری چاہت و پسند کا لیول ایک ہی ہے۔ اگر بچے مارکیٹ میں بک رہے ہوتے تو میں ڈھیر سارے بچوں سے اس گھر کو بارونق بنا ڈالتی۔ میری پسند فطری ہے حسنات۔'' سائرہ نے بڑی لاچاری سے ان کی آنکھوں میں جھانکا اور بڑی بے بسی سے بولی۔

"پھر وہی جاہلانہ و بے وقوفانہ راگ...... میری زندگی میں تو ایسا ہونے والا نہیں، یہاں بچے کی آواز ناقابلِ برداشت ہے۔ بچے کا رونا اور چیخ و پکار.. اس گھر کا سکون و قرار غارت مت کرو، ورنہ یہ گھر چھوڑ دوں گا۔" وہ تقریباً چیخ کر بولے۔ "پھر بھی میں ایک سال بعد کا وعدہ کر رہا ہوں، اسٹامپ پیپر لاؤ لکھ دیتا ہوں.. فی الحال اس وقت میری طرف سے اجازت نہیں۔"

"اور اس معصوم کا کھیلنا کودنا، قلقاریاں کرنا، توتلی میٹھی، میٹھی باتیں کرنا اسے کیا نام دیں گے آپ؟ گھر کی خاموشی میں گہما گہمی اور رونق سما جائے گی۔ مجھے تو اس دن کا ابھی سے انتظار رہنے لگا ہے۔" وہ بچے کے فسوں میں کھو کر بولی۔

"سائرہ تم میری بات کو نظر انداز کرنے کی گستاخی نہیں کر سکتیں۔" وہ اسے جھنجوڑتے ہوئے بولے۔ "فوراً تیار ہو جاؤ۔ مجھے تمہارے وجود سے گھن آنے لگی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے ہی نکال دوں، ہماری اچھی گزر رہی ہے، اسی طرح اس زندگی کو گزر جانے دو پلیز۔ اتنا اہم اور عظیم فیصلہ کرنے کے لیے مجھے وقت چاہیے۔ ذہنی طور پر تیار ہونے کا فائدہ نہ تو مجھے ہوگا نہ ہی تمہیں بلکہ آنے والے بچے کو اس کا فائدہ ہوگا۔ جسے ہم کوالٹی ٹائم دے سکیں گے۔" وہ اب اسے اپنی بانہوں میں بھر کر نرمی سے بولے تو سائرہ رحم لانہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"حسنات! پلیز صرف ایک بچے کی التجا ہے، دوسرے کا نام نہ لوں گی۔" وہ ان کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنا سر ان کے سینے سے لگا کر التجائیہ انداز میں بولی۔

"مجھے کچھ نہیں سننا۔" انہوں نے اسے جھٹکے سے پرے کیا تو اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ تکیے پر گر گئی۔ وہ اس کی سائڈ پر بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اس منانے میں بھی جاڑے کی کپکپی تو گرما کی چبھن کا کھیل جاری تھا مگر وہ ایسی قبیح حرکت ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ جھٹکا لگنے سے اس کا سر چکرانے لگا تھا اور متلی ہونے لگی تھی۔

"مجھے آپ کی ناراضی ... بیکار کے اعتراض اور اس شدید ردِ عمل کی قطعاً پروا نہیں...... کیونکہ مجھے ایک مکمل عورت بننے کا حق قدرتی طور پر انعام کی صورت میں سونپا گیا ہے اس لیے ایک معصوم سی جان کے قتل کے تصور سے ہی میرے رگ و ریشے میں ہم دونوں کے زوال اور سزا کا ڈر خوف سرایت کر گیا ہے۔ حسنات آپ نے ہر مفکر اور مولانا کی تفسیروں کو کھنگال رکھا ہے۔ کیا یہی فرمانِ الٰہی ہے کہ آنے والی روح پر آپ قابض ہو جائیں اس پر تو ہمارے مالک کا اختیار ہے۔" وہ اس لمحے خود سے بے خبر بیزاری اور الجھن سے بولی تو اس کے حوصلے ... ہمت اور مقابلہ کرنے کی جرأت کو محسوس کرتے ہوئے وہ اسے حق دق دیکھنے لگے۔ وہ تیزی سے واش روم کی طرف بھاگی اور اس کی قے کرنے کی آواز سن کر حسنات نے نفرت اور حقارت سے اندر جھانکا اور قہر آلود لہجے میں بولے۔

"تم کان کھول کر سن لو، اگر ایک گھنٹے میں تیار نہیں ہوئیں تو اپنے باپ کے گھر جانے کی تیاری کرنے میں دیر مت لگانا۔ مجھے تم جیسا خودسر، دُہری شخصیت کا مالک جیون ساتھی نہیں چاہیے۔" حسنات نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی ناگوار نظر ڈالی اور وہاں سے چلے گئے۔

"آپ کی اس انہونی خواہش کی میں کبھی تائید نہیں کروں گی۔ میں آپ کی بہترین ہم سفر نہ سہی آپ کی دشمن ہی سہی، مجھے منظور ہے مگر یہ گناہِ کبیرہ کبھی نہیں کروں گی۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

"سائرہ اگر تم تیار ہو چکی ہو تو بتاؤ، میں تمہارے ساتھ اسپتال چلو یا ڈرائیور تمہیں میکے چھوڑ آئے۔" گھنٹے بھر بعد اُن کی آواز آئی جسے سن کر وہ سرتاپا لرز کر بیڈ سے اتر گئی۔

☆☆☆

"حسنات! مجھے تم سے ایک سوال کا جواب چاہیے۔ اگر ہماری اماں آج زندہ ہوتیں تو وہ بھی تم سے یہی سوال کرتیں۔ آج تو ان کی روح تڑپ اٹھی ہوگی۔" بڑی بہن عصمت آئی سی یو میں سائرہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے حسنات پر برس رہی تھیں۔ لہجے میں خفگی اور افسردگی تھی اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"آپا! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ اماں کی روح بے چین کیوں ہوگی؟ کوئی صدقہ خیرات کیے دیتا ہوں میں۔" وہ انجان بنتے ہوئے بولے۔

"بچے کو اس دنیا میں آنے سے روکنے والے تم ہو کہ سائرہ؟" وہ پژمردگی سے بولیں۔ "دیکھو مجھ سے سیدھی اور سچی بات کرو، خبردار جو کچھ چھپانے کی کوشش کی۔"

"ہم دونوں نے مل کر مشورہ کیا اور فیصلہ بھی ہم دونوں کا ہی تھا...... ایک سال بعد فیملی بڑھانے کے بارے میں سوچا جائے گا۔ فی الحال ہم دونوں ہی ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ آپا میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں ایک ایسا بچہ پرورش پا رہا ہو جس کی نہ کوئی اہمیت ہو اور نہ ہی وہ والدین کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ وہ بچہ جوان ہو کر بالکل ہی نامکمل اور ادھوری شخصیت کا مالک ہوگا۔" وہ بڑی خود اعتمادی سے بودا سا جواز پیش کر رہے تھے۔

"تم نے اپنی عمر ملاحظہ فرمائی ہے، جوانی کے بچے والدین کو تمام فرائض سے وقت پر فارغ البال کر دیتے ہیں۔ اب مجھے دیکھو اور باقی بہنوں اور بھابیوں کا موازنہ کرو۔ سب اپنے فرائض کی ادائیگی کے بعد اپنی زندگی کے ہر لمحے سے محظوظ ہو رہے ہیں جبکہ مجھ پر چھوٹی بیٹی کی ذمے داری کیوں ہے؟ کیونکہ وہ دنیا میں لیٹ پہنچی تھی۔ تم نے آج تک اپنے وقت کو ایک روٹین میں سیٹ ہی نہیں کیا۔ ماں جی کہتی تھیں کہ تم شادی کے بعد بالکل بدل جاؤ گے۔ سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے کے ساتھ چلنے لگو گے۔ اس کلاک کی ہر سوئی میں اپنا پروگرام فیڈ کرنے لگو گے پھر تمہارے پاس وقت کی کمی نہیں ہوگی۔ بلکہ تمہیں کام کی کمی اور وقت کی زیادتی کا احساس ہونے لگے گا۔ مگر ماں جی کی تھیوری کو ناکام کرنے میں تم تو بے مثال نکلے، کتنے افسوس کا مقام ہے... اپنی تعلیم دیکھو اور اپنی جاہلانہ سوچ کو پرکھو، لگتا ہے، زمانۂ جاہلیت کے دور کے باشندے ہو۔" عصمت آپا نے لمبی سرد آہ بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپا میں انہی صلواتوں اور نصیحتوں کی وجہ سے کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ میری اپنی زندگی ہے اس پر مجھے ہی اختیار ہونا چاہیے۔" وہ بیزاری سے بولے اور سائرہ کی طرف بڑھ گئے۔ جسے ڈاکٹر بلڈ کی دوسری بوتل لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور سائرہ کی آنکھوں میں پرلے درجے کی ویرانی اور لاچاری کی تاریکیاں بسیرا کر گئی تھیں۔ لبوں پر نہ ٹوٹنے والی خاموشی تھی۔ حسنات نے اس کے بالوں پر نہایت ملائمت سے ہاتھ پھیرا۔ سائرہ نے ناگواری سے ان کا ہاتھ پرے کو ہٹا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ حسنات نے ندامت بھری نظروں سے عصمت آپا کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں کی زبان پڑھ کر بے نیازی و بے پروائی کا سہارا لیتے ہوئے بولے۔ "اب سائرہ کی حالت بہتر ہے فکر کی بات نہیں۔ آپا! میں اب چلتا ہوں...... آج مجھے ایک بہت اہم میٹنگ کے لیے HEC جانا ہے۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی قسم کی فکر نہیں ہوگی۔"

"تم میری غیر موجودگی میں بھی کسی قسم کا کوئی پرابلم محسوس نہیں کرو گے۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ اپنے جیون

ساتھی کے لیے بھی اتنے ہی بے حس اور بے پروا ہوگے تو تمہاری شادی نہ ہونے دیتی۔'' وہ دل میں ہی کہتی ہوئی کھول گئیں۔ ان کا دل چاہا اس ارسطو، افلاطون اور سقراط کے ناناکے منہ پر تھپڑوں کی بارش کردیں۔

''میٹنگ کے بعد آنے کی کوشش کروں گا۔ بس سائرہ کو تسلی و تشفی دیجیے گا۔ اور سمجھائیے گا کہ دہ ہے تو بچوں کی قلت نہیں ہوگی۔ اس وقت ری کور کرنا ضروری ہے۔'' وہ آہستگی سے بولے اور سائرہ کی طرف خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف چل پڑے۔ بیٹی کے مقدر لکھنے کا اختیار والدین کو سونپا جاتا تو کیا ہی خوب ہوتا۔ کبھی دل نالاں نہ ہوتا، آنکھ میں جھڑی نہ لگتی، نیندیں نہ اُڑتیں اور ایسے ناہنجار مرد ہمیشہ کے لیے تنہائی کا شکار ہوجاتے۔ دوسروں کی لاڈلی بیٹیاں ان کے من گھڑت و من پسند اصولوں کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئی ہوتیں۔ وہ سائرہ کی طرف ترس و رحمدلانہ نظروں سے دیکھ کر سوچے جارہی تھی۔ اس حالت میں وہ کسی قسم کا سوال پوچھ کر اسے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں اس لیے خاموشی سے اس کے قریب ہی رکھے اسٹول پر بیٹھ گئیں اور خود کو لعنت ملامت کرنے لگیں جنہوں نے اپنے بھائی کی تمام خصلتوں اور عادات کو جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی اس کی شادی کی حمایت کرڈالی تھی محض اسے سدھارنے کی امید و بیم میں ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرتے ہوئے اماں جان کو خوفِ خدا کیوں نہیں آیا۔

☆☆☆

''سائرہ اب کیسا فیل کررہی ہو؟'' حسنات نے بیڈروم سے ملحقہ اسٹڈی سے جھانکتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

''اللہ کا کرم ہے۔'' وہ منمنائی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ حسنات نے اس کے قریب آنے کے بجائے وہیں سے واپسی کو بہتر سمجھا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر کسی ڈیلی نیوز کے لیے لکھے ہوئے آرٹیکلز پر نظریں جما کر بیٹھ گئے۔ جب اپنے فسوں سے باہر نکلے تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ ایک تسلی بخش بھرپور انگڑائی لے کر انہوں نے وہیں رکھے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگا کر غٹا غٹ پینے لگے۔ پھر بیڈروم میں جھانکا۔ سائرہ نے جنبش نہ کی تھی کیونکہ وہ ٹرینکولائزر لے کر سوچکی تھی۔ انہوں نے ایک طویل سانس لی اور عینک اتار کر واپس اسٹڈی میں چلے گئے۔ لائٹس آف کرکے وہیں کاؤچ پر لیٹ گئے۔ چند سیکنڈ میں ہی ان کے زوردار خراٹے اسٹڈی کے کھلے دروازے سے ملحقہ بیڈروم کی فضا میں منتشر ہونے لگے۔ ان کی بے ڈھنگی آواز میں اس قدر انتشار تھا کہ سائرہ مصنوعی گہری نیند کے باوجود ہڑبڑا کر جاگ گئی۔

اس نے بے اختیاری میں حسنات کی سائڈ پر ہاتھ پھیرا۔ انہیں وہاں موجود نہ پاکر لاشعوری طور پر اس نے اِک طویل آہ بھری اور نیند جو کھل چکی تھی۔ اب تمام سوچوں کے ہمراہ مکمل طور پر کچوکے لگانے لگی تھی۔ ذہن کو ہر سوچ سے بے بہرہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوتی چلی گئیں تو وہ اٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''حسنات تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ محض اپنی ماں کو خوش کرنے کی خاطر میری ہنستی مسکراتی زندگی کے خریدار کیوں بن گئے۔ تمہیں بیوی کی ضرورت کبھی محسوس ہی نہیں ہوئی تھی تو پھر اتنا بڑا ظلم کرتے ہوئے تمہارا دل خوفِ خدا سے لرزا کیوں نہ تھا۔ اب مجھے اس سوال کا جوب دو کہ پہاڑ جیسی جوانی کا اتنا طویل سفر کیسے کٹے گا۔ کیا اسی طرح تنہا اور لاوارث و بے کس عورت کی طرح آہ و بکا کرتے ہی ساری زندگی بتادوں گی؟'' وہ خود ترسی کا شکار تھی۔ ''میرے اندر کے تمام بھیانک احساسات کو اپنی قربت اور پیار سے ختم کردو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا والوں کے سامنے تمہاری اصلیت کو تار تار.... کردوں، یہ جو مج

ہم دونوں نے اپنے تعلق و ربط اور رشتے کا بنا رکھا ہے، ریزہ ریزہ نہ کردوں۔ ایسا کرنے سے خاندان کی عزت و وقار تاراج ہوجائے گا۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن میں زندہ درگور ہوجاؤں گی۔ معاشرہ مجھے قبول نہیں کرے گا۔ میری کمزوریوں اور بزدلی کو سمجھتے ہوئے تم میری قدر دانی کرنے کے بجائے مجھے آلتو فالتو بے جان شے سمجھ کر اپنی خود ساختہ عارضی اور وقتی دنیا میں کھو گئے ہو۔ مجھے مر کر ہی تم سے کنارہ کشی اختیار کرلینی چاہیے۔ تمہیں تو جب بھی گلٹ (شرمندگی) بیدار نہ کرسکے گا، تم ہو ہی پتھر سے بنے ہوئے انسان، میں تمہیں بھی ایسی مار دوں گی کہ کیا یاد کروگے؟ کہ تم نے عورت کو اس قدر حقیر جانا، اتنا مجبور سمجھا۔'' وہ خود کلامی کرتی ہوئی بیڈ سے نیچے اتری۔ ہولے ہولے قدم اٹھاتی وہ اسٹڈی کے ادھ کھلے دروازے کو کھول کر کاؤچ پر سوئے ہوئے حسنات کو دیکھنے لگی۔ وہ بنیان شرٹ ہی پہنے سکڑ کر لیٹے ہوئے گہری نیند میں تھے۔ گیس ہیٹر آن تھا اس نے آگے بڑھ کر ہیٹر آف کیا اور بیڈروم سے کمبل اٹھا کر ان پر ڈال دیا۔

☆☆☆

''سائرہ، تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے؟ تم میری بیٹی جیسی ہو اس لیے تمہیں سمجھانا ضروری سمجھتی ہوں۔ ہر وقت ماتمی حالت میں رہنا شوہر کو قطعاً پسند نہیں ہوتا۔ اس کی نظریں کسی اور کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ دل میں کوئی اور بسنے لگتا ہے اور بیوی کو اس وقت خبر ہوتی ہے جب دوسری عورت اس کے گھر پر قابض ہوجاتی ہے۔'' عصمت آپا نے گھر میں قدم رکھتے ہی سائرہ کو اول جلول حالت میں دیکھ کر سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

''آپ کے بھائی کو یہ سب کرنے کا وقت ہی کب ہے؟'' وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''انہیں تو کسی حور پری میں بھی کوئی چارم نظر نہیں آتا۔''

''ہمارے معاشرے کی عورت کا دل گوشت پوست کا نہیں پتھر کا ہو تو تب وہ اپنی زندگی میں کامیاب مانی جاتی ہے۔ دل کو روگ لگالینا اور اپنے ذہن کو بے لگام رکھ کر سوچے چلے جانا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ میری منی سی بھابی اپنی سوچ پر قفل لگادو تاکہ تمہارے من میں کسی آرزو کا دخل ہی نہ ہو۔ کوئی سوچ ہی نہ ابھرے۔'' وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

''اس سوچ کو جس پر میرا حق ہے، عصمت آپا اسے قید کیسے کردوں؟ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ آپ بھی تو میری ہم نفس ہیں۔ میرے دل کی گہرائیوں میں جھانکنے کا اختیار رکھتی ہیں۔ آپ تو میرے احساسات و جذبات سے واقف ہیں۔'' وہ روہانسی ہوگئی تھی۔ ''مجھے اولاد چاہیے عصمت آپا، بس اور کچھ بھی نہیں۔''

''تو پھر ایک ہی علاج ہے۔'' عصمت نے سوچتے ہوئے اس کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ علاج بتائیے آپا؟'' وہ ایک دم سے چونکی ہوکر بولی۔

''حسنات کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ہوگا۔'' وہ بے اختیاری سے بولیں۔

''نہیں آپا، یہ نہیں ہوسکتا...... آئی لو ہم...... میرے بغیر وہ اکیلے رہ جائیں گے۔ ان کے کھانے پینے کا، ان کے آرام کا کون خیال رکھے گا۔ وہ تو خود سے بھی اتنے بیگانہ رہتے ہیں کہ دو دن کھانا نہ ملے تو کبھی بھوک کا اظہار نہیں کرتے، کپڑے تیار نہ کروں تو بغیر استری شدہ کپڑے پہن کر یونیورسٹی چل پڑتے ہیں، ایسے لوگ کمزور ہوتے ہیں، کیئر نہ کریں تو فوراً ہی ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور نوکروں کی حالت سے تو آپ اچھی طرح

واقف ہیں۔ بھلا وہ پروا کیوں کریں گے۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

"تو پھر بچے، خود کو سنبھالو اور اپنی ان تمام خواہشات کو اپنے دل سے نکال دو، جن سے حسنات کا دور پار کا بھی واسطہ نہیں۔ ورنہ روگ لگائے بیمار پڑ جاؤ گی۔" آپا نے نہایت پیار و ملائمت سے کہا۔ "حسنات تو ہمیشہ سے ہی لکی تھا۔ تمہارے جیسی بیوی کا حصول تو اس کی خوش بختی کی نشانی ہے، تم اس کے کہنے کے مطابق اپنی پڑھائی شروع کر دو، دل بھی بہل جائے گا۔ حسنات بھی تم سے خوش ہو جائے گا پھر ممکن ہے کہ تمہاری تمنا پر غور و خوض کرنے پر مجبور ہو جائے۔"

"ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے آپا، ہم روز بروز اپنی عمر میں، آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔" وہ اک طویل آہ بھر کر بولی۔ "مجھ میں مزید پڑھنے کی سکت نہیں رہی، جب دل میں جینے کی امنگ ہی نہ رہے تو کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ مجھے اپنی اس بے مقصد زندگی سے پیار ہے نہ ہی اس کی چاہ ہے۔"

"بیٹا اس طرح تو تم ڈپریشن میں جا رہی ہو، کسی کے سامنے ایسی مایوس کن باتیں مت کرنا، سب تمہیں پاگل کا خطاب دے کر تمہارا تمسخر اڑائیں گے۔ ڈپریشن کا علاج ہے، تم بھی تو اچھی طرح جانتی ہو....." آپا خوف زدہ سی ہو کر بولیں۔ "کسی سائیکاٹرسٹ سے مشورہ لینے میں کوئی قباحت نہیں، میں ابھی بات کرتی ہوں حسنات سے۔"

"اس کی ضرورت نہیں آپا، میں ٹھیک ہوں، میرے ڈپریشن کو بیماری کا نام دینا درست نہیں۔ یہ تو حالات کی وجہ سے مجھ پر طاری ہوتا جا رہا ہے، اپنے بھائی کو سمجھائیں کہ میری خوشیوں اور راحتوں کو اپنی غرض اور اپنی چاہ کی بھینٹ مت چڑھائیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "آپا جان، یقین کریں میں ضد نہیں کر رہی۔ حسنات سے جب بھی بات کرتی ہوں، مجھے ضدی بچہ کہہ کر میری بات سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ مجھے تو اب یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے اس دنیا کا ہر فرد مجھے قصور وار ٹھہرا رہا ہے جبکہ ایسا ہرگز نہیں...... آپ سب لوگ میرے بچے کے قاتل ہیں، میں کسی کو بھی معاف نہیں کروں گی اور اگلی دنیا میں اپنے اسی معصوم ان دیکھے بچے کی انگلی پکڑ کر پل صراط پار کر کے جنت میں داخل ہو جاؤں گی۔ حسنات اور سب دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ تو عصمت کی آنکھوں سے بھی ساون کی جھڑی پھوٹ نکلی۔

☆☆☆

"ڈاکٹر صاحب، آپا خواہ مخواہ اتنی فکر مند ہو گئی ہیں، میں ٹھیک ہی تو ہوں۔" سائرہ نے ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ہمایوں سے خود اعتمادی سے کہا تو وہ مسکرا کر اپنائیت سے اسے دیکھنے لگے۔ عصمت نے ہمایوں کے آنکھ کے اشارے کو سمجھ لیا اور چپکے سے باہر ویٹنگ روم میں جا بیٹھیں۔ آپا نے سائرہ کے منع کرنے کے باوجود دو ہفتوں میں ہی ماہرِ نفسیات سے ٹائم لے لیا تھا یہ ایک تجربے کار اور اچھی شہرت کے حامل .... ڈیڑھ گھنٹے کی طویل گفتگو کے بعد جب سائرہ باہر نکلی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور ناک لال ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود چہرے پر اضطراری کیفیت میں خاصی کمی نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔ عصمت نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل کر پارکنگ کی طرف چل دیں۔

"سائرہ جان، ڈاکٹر ہمایوں کیسے لگے؟" عصمت نے آہستگی سے کہا۔

"بہت اچھے، مسیحا اور ہمدرد، آپ کا بہت بہت شکریہ، بہت قابل ڈاکٹر ہیں، دل کی بات کو پکڑنا خوب آتا ہے۔" وہ پُرستائش لہجے میں بولی۔

"کبھی کبھار بڑوں کی بات مان لینے میں بے حساب فوائد ہوتے ہیں، میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ تم نے آخر کار میری اس تجویز پر غور کیا۔ کسی کے سامنے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، خواہ مخواہ ہر ایک کن سوئیاں لینے لگے گا۔" وہ رازدارانہ انداز میں بولیں۔ "اب اگلی سٹنگ کب ہے؟ تاکہ میں تیار رہوں۔"

"ایک ہفتے بعد انہوں نے بلایا ہے، عصمت آپا! اب میں آپ کو تکلیف نہیں دوں گی، خود ہی آ جاؤں گی۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ میں ہوں بالکل ٹھیک ٹھاک۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔

"وہ تو ہے...... پھر بھی شک کو اپنا رفیق کیونکر بنائیں۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کچھ تو قیمت ادا کرنا ہی پڑے گی ناں۔ اور وہ قیمت ہے ڈاکٹر ہمایوں۔"

"اور ان کے مشورے پر عمل کرنا۔" وہ بھی ہلکا سا مسکرا کر بولی۔

ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو دونوں مطمئن اور پُرسکون سانس لے کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

آخر ڈاکٹر ہمایوں نے اس کی صحت یابی کو محسوس کرتے ہوئے اس کی میڈیسن کو آہستہ، آہستہ کم کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ وہ اس عارضی اور وقتی سہارے کے بغیر اپنی زندگی پر گامزن رہ سکے۔ اسے میڈیسن کو خدا حافظ کہنا مشکل نہ تھا۔ مگر ہمایوں کو الوداع کہنا وبالِ جان بن گیا۔ چہرے پر تسکین و طمانیت میں بے چینی و بے قراری کی آمیزش نظر آنے لگی۔ گھر پھر سے بکھرنے لگا۔ خوش لباسی و خوش گفتاری پر منفی سوچوں کی چھاپ لگنے لگی۔ حسنات کی ہر بات اور ہر حرکت پر پھر سے اعتراضات کی بھرمار ہونے لگی۔ اس کے مزاج کی اس تبدیلی کو حسنات جیسے بے حس و خود غرض انسان نے بھی بری طرح محسوس کر لیا تھا۔ مگر اس سے پوچھنا اور اپنا وقت اس غیر مناسب مسئلے کی نذر کر دینا انہیں قطعی منظور نہیں تھا۔ آج اور کل میں ہی دن گزرتے گئے۔ مگر وہ اس کی

طبیعت کی تبدیلی کی وجہ پوچھنے سے کنی کتراتے رہے اور اپنی زندگی میں مصروف وشاداں رہے۔ یہ نامناسب ردِعمل سائرہ کو بتدریج کھوکھلا کرتا گیا۔ ڈاکٹر ہمایوں سے ملنے کی تڑپ اس کے دل میں بڑھنے لگی۔ وہ ماضی میں گم سی ہو کر حسرت و یاس سے سوچنے لگی۔ ''وہ دن کتنے اچھے تھے۔ جب میری پہلی ملاقات ڈاکٹر ہمایوں سے ہوئی تھی اور سالوں بعد میں نے جی بھر کر باتیں کی تھیں۔ دل کو کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا اور وہ میرے دل کے زخموں پر اپنی گفتگو کی چاشنی سے مرہم رکھ رہے تھے اور میرا درد ایک دم سے کم ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس بے قرار دل نے سکون واطمینان کی گھنٹی بجا کر میرے ذہن کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ اس میں مثبت سوچوں نے بسیرا کرنے کی ٹھان لی تھی۔ دوسرے وزٹ پر ہی وہ مجھے اپنے مربی اور مسیحا لگے۔ میں نے یونیورسٹی اور حسنات کی سخت مزاجی کے قصے اور اپنی لیاقت کے بارے میں تفصیلاً انفارمیشن دے کر انہیں امپریس کر ڈالا تھا۔ وہ میری ذہنی صحت کے لیے فکر مند رہنے لگے تھے۔ وہ ہر قیمت پر مجھے زندگی کی تمام تر دلچسپیوں اور رعنائیوں میں واپس لانا چاہتے تھے۔ وہ انہماک سے میری ہر بات سن کر اہمیت دیتے اور پھر خوب مدح سرائی کرتے، لطیفے سناتے اور میرے بچپن کی شرارتیں سن کر محظوظ ہوتے۔ میرے ساتھ ایسا سلوک درویہ حسنات کا تو کبھی نہیں ہوا۔ ڈاکٹر ہمایوں سائیکی جان چکے تھے میرے مرض کو انہوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی شہد میں ڈوبی ہوئی میری پسند کی باتیں سماعتوں میں تحلیل ہو کر مجھے ذہنی طور پر زندگی کے قریب تر کرتی گئیں۔ جب میں صحت یاب ہو کر اپنی دنیا میں واپس آئی ہوں تو پھر دوبارہ اسی فیز میں کیوں چلی گئی ہوں؟'' وہ سوچنے لگی اور اس سچائی اور حقیقت کو جان کر کہ وہ ڈاکٹر ہمایوں کی کمپنی کو پسند کرنے لگی ہے۔ اسے اپنے دل کے بہت نزدیک محسوس کرتے ہوئے وہ دہل سی گئی تھی۔ اس بے قراری اور اضطرابی کیفیت میں کئی راتیں گزریں۔ خود کو سمجھانے کے باوجود اس کا ذہن عجیب کشمکش میں مبتلا رہا۔ دل میں ڈاکٹر ہمایوں سے ملنے کی ہوک تمام ارادوں پر چھا جاتی۔ جب احساسِ گناہ آنکھ کھولتا تو خود کو لعنت ملامت کرتی کہ یہ وہ کس ڈگر پر چل پڑی ہے۔

آخر اپنی ذہنی طمانیت اور دلی سکون کی خاطر اس نے ڈاکٹر ہمایوں کو فون کرنے سے پہلے خود کو تیار کیا کہ وہ محض ایک نفسیاتی ڈاکٹر ہے، زبان کی مٹھاس اور شگفتہ و جاندار اندازِ گفتگو اس کا پیشہ ہے اور اس کا یہی انداز مریض کو سب سے زیادہ بھاتا ہے خصوصاً صنفِ نازک کو مگر یہ اس کا پروفیشنل انداز تھا۔ ورنہ وہ نفسیات کا ماہر ڈاکٹر نہ ہوتا بلکہ سرجن ہوتا۔ چھری، قینچی کے ہمراہ۔

''کہیں اس کی میٹھی زبان میرے دل پر چھری کا کام تو نہیں کر گئی۔ اوہ مائی گاڈ میں ایسا کیوں سوچتی ہوں، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے، کیا میں اتنی ہی کمزور واقع ہوئی ہوں، ویری بیڈ۔'' اگلے ہی لمحے اندر سے ایک آواز ابھری۔ ''اپنے دل کو مضبوط کرو اور ذہن کو جگا کر سوچو۔ تم غلطی پر ہو، ڈاکٹر ہمایوں صرف تمہارا معالج ہے۔ تمہاری ذہنی اختراعات تمہیں کسی اور ڈگر پر دھکیل رہی ہیں، وہ ڈگر آگ ہے، جہنم اور بھڑکتے ہوئے شعلے اور چنگاریاں ہیں۔''

''نہیں، نہیں ہرگز نہیں۔'' دل کی اس آواز پر ایک دفعہ وہ ہوش میں آئی اور اپنے وجود میں قوت وطاقت کو بحال کرتی رہی۔ جب اس نے خود کو قدرے نارمل محسوس کیا تو ڈاکٹر ہمایوں کو فون ملانے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں پھرتی اور چستی تھی۔ مزاج کا چڑچڑاپن اور کرب و اذیت کا جان لیوا احساس قدرے کم پڑ گیا تھا کیونکہ اس نے اس بات پر سرِ تسلیم خم کر لیا تھا کہ وہ محض اس کا ڈاکٹر ہے اور یہ اس کی پیشنٹ ہے، جونہی اس کی نرم و ملائم خوشگوار آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو تمام خود سے کیے گئے عہد و پیمان اور ارادے متزلزل ہونے لگے۔

اسے محسوس ہوا جیسے وہ ہواؤں کے دوش پر اڑتی جا رہی ہے۔ اس کے دل میں مسرت وراحت کی شہنائیاں بجنے لگی ہیں۔ اس سے وزٹ کا ٹائم لے کر جونہی موبائل آف کیا تو اپنے سامنے قدِ آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر اچنبھے سے خود پر غور کرنے لگی۔ میلے کچیلے سلوٹوں سے بھرپور کپڑے اور الجھے ہوئے کھلے بال اور چہرے پر شگفتہ گلاب جیسی لالی اور مسحور کن مسکان کے اس امتزاج میں وہ کس قدر پُرسکون لگ رہی تھی۔ اس نے خود سے ہی سوال کیا۔

''ایسا کیوں ہے؟'' پر صحیح جواب سننے کی ہمت نہیں تھی۔

''کیا پسندیدگی ہے یا محض اس کی خوشگوار و شگفتہ باتوں کا اثر ہے؟ تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو، خود کو بے وقوف مت بناؤ۔'' انصاف کو مدِنظر رکھ کر وہ اپنی ماں کی باتوں پر غور کرنے لگی۔

''جس رشتے کے سامنے کمزور پڑ جاؤ، سمجھو کہ تم پر زوال آنے والا ہے، جہاں سے سکون ملے، سمجھو کہ تم اپاہج ہو گئی، جس کی چاہ میں پاگل ہونے لگو وہ رستہ چھوڑ دو۔'' اور آخر اس نے اپنے من سے ڈپریشن کے بیج کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی ٹھان لی۔ جس میں ڈاکٹر ہمایوں کی میٹھی اور تسلی بخش باتوں کی ضرورت رہی نہ اس نے کسی دوا کے سہارے کو محسوس کیا۔ وہ اپنی دیرینہ اور اہم خواہش کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی ماہرِ نفسیات خود ہی بنی۔ یہ اٹل فیصلہ تھا۔ ''وہ حسنات کی ہے اور اس کے ذہن و قلب پر اسی کی اجارہ داری رہے گی۔ ڈاکٹر ہمایوں کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔''

یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس کے چہرے پر اطمینان کی سرخی بکھرنے لگی اور اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنی صحت پر دے ڈالی۔ بکھرا ہوا گھر اس کے مزاج کے مانند سلجھ گیا تھا اور ایک دن منوں بھاری خبر سن کر اس نے اسے اپنے ہی دل کے نہاں خانوں میں دفن کر دیا۔ اس بار وہ حسنات کے ظلم وستم کا نشانہ بننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ وہ ان نازک گھڑیوں سے نکل کر یہ مژدۂ راحت حسنات کے گوش گزار کرنا چاہتی تھی۔ اسے دھماکے کی خبر تو تھی مگر وہ اسے عارضی لگ رہا تھا۔ ایک معمولی جھٹکا اور پھر ہلکے شاک کے بعد سکون ہی سکون...... اور شکرانہ ہی شکرانہ......

☆☆☆

پانچ مہینے کا عرصہ طبیعت کی خرابی کے باوجود نہایت تسلی و تشفی میں گزر گیا۔ حسنات حسبِ معمول اپنی کتابی دنیا میں مگن اس کی نقاہت اور چہرے کی پیلاہٹ کو محسوس ہی نہ کر سکے۔ سائرہ کی معمولی سی احتیاط نے اس راز پر پردہ ڈالے رکھا۔ جب اس کی بڑھتی ہوئی جسمانی ہیئت پر خاندان کی عورتوں نے معنی خیز سوال کرنے شروع کیے تو سائرہ کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ دل اچھل کر حلق میں آنے لگا کہ اب وہ وقت آ چکا ہے کہ اس حسین بھید کی پردہ کشائی کی جائے۔ اس سے پہلے کہ دوسروں کی طرف سے یہ خبر مبارک کی صورت میں حسنات کے کانوں میں زہر انڈیل ڈالے، کیوں نہ خود ہی شیرینی سے بھرپور معجزہ ان کے گوش گزار دے۔ جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا.... فی الحال اسے اس مشکل مرحلے کا نہایت دانشمندی سے سامنا کرنا تھا۔ اسے حیرت تھی حسنات اس کی ظاہری حالت سے اس قدر بے پروا تھے۔ حسنات بسترِ ریشم دراز اپنا پسندیدہ مشغلہ سائرہ پر مسلط کر رہے تھے۔ space کے معجزات کا ذکر، دنیا کے وجود میں آنے کی تھیوری اور مختلف مرتد رائٹرز کے غیر مناسب اور بے تکے خیالات سنتے ہوئے یہ صرف ہوں، ہاں یا، یس کا ہی سہارا لیا کرتی تھی۔ اسے ان باتوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں تھا مگر وہ جو بڑھتے اسے ٹو ڈی اس سے شیئر کرنا چاہتے تھے۔ یہ بہترین سامع تھی جبکہ وہ اس کی کسی بات کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ اس کی باتوں کا معیار ان کی سوچ کے مطابق زیرو تھا۔

آج انہیں خوشگوار موڈ میں دیکھ کر سائرہ نے موقع غنیمت جانا اور ان کے سینے پر سر رکھ کر الفاظ کی ادائیگی سے پہلے تھوڑا خوف زدہ ہو کر لرزی۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔

''کچھ پریشان سی ہو گئی ہو ایک دم سے...... کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ کی وسعت کا اندازہ لگانے میں ناکام ہو گئی ہو؟'' وہ حیرت سے بولے تو بہ مشکل اس کی زبان نے جنبش کی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''میں تمہیں دیکھ کر ہر بار رب العزت اور آپا کا شکر ادا کرنے لگتا ہوں کہ آج جو تم ہو، انہی کی مہربانیوں کی وجہ سے ہو، میں نے آپا کی عقلمندی اور دور اندیشی سے ایک سبق عمر بھر کے لیے سیکھ لیا ہے کہ اداسی، بدگمانی، بے یقینی اور مایوسی کے وارد ہوتے ہی ماہرِ نفسیات سے رابطہ کرنا چاہیے۔'' وہ ملائمت بھرے لہجے میں بولے۔

''حسنات! ماہرِ نفسیات کا کوئی کمال نہیں، ہمیں اپنا موازنہ خود کرنا چاہیے اگر ہم پیدائشی طور پر نارمل ہیں، صحت مند ہیں، بالغ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے نشیب و فراز سے مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں بلکہ یوں سمجھیں کہ بچوں کے ذہنی ٹیسٹ لینے سے ہمیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ اپنے خراب رزلٹ کو بچے نے کس طریقے سے لیا ہے۔ ناکامی پر دوبارہ کمر بستہ ہونے کا فیصلہ بہ آسانی کر سکتا ہے یا دل برداشتہ ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے گا۔ دوسروں کے سامنے شرمندگی مٹانے کے لیے دوسروں کو ہی موردِ الزام ٹھہرائے گا یا اپنی نالائقی اور غلطی کا اعتراف کرنے میں اس کی انا و خودداری کو جھٹکا تو نہیں لگے گا۔ بس آئندہ بھی زندگی میں رونما ہونے والے تمام چیلنجز کو ہنس کر قبول کرتا ہے یا دنیا والوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں بہتری محسوس کرتا ہے، بس یہی بی ہیویر اس کے ساتھ عمر بھر چلتا ہے اور جو لوگ اسٹرونگ ذہن کے مالک ہوتے ہیں وہ اپنی ڈپریشن کی وجہ خود معلوم کر کے اپنے ہی ماہرِ نفسیات بن کر علاج کرنے لگتے ہیں کیونکہ ننانوے فیصد لوگ پیدائشی نارمل ذہن لے کر اس دنیا میں تشریف فرما ہوتے ہیں۔'' وہ تفصیلاً گفتگو اِک خاص مقصد کے تحت کر رہی تھی۔

''بھئی تمہیں تو سائیکا ٹرسٹ ہونا چاہیے تھا۔ تمہاری باتوں میں وزن ہے، یعنی ڈپریشن لاعلاج بیماری نہیں۔ اس میں خود کو مطمئن و پُرسکون رکھنے کی ضرورت ہے۔ سائرہ اب تم نارمل ہو، صحت بھی خوب بنالی ہے تم نے، میرا خیال ہے تم اپلائیڈ سائیکالوجی میں ماسٹرز کیوں نہ کر لو پھر بعد میں پی ایچ ڈی۔'' وہ اس کی باتوں سے قدرے مطمئن تھے۔

''دیکھو میں نے تو اپنا دماغ اپنے آباؤ اجداد سے لیا ہے اور تمہارے فیملی سیٹ اپ کے حساب سے دیکھا جائے تو تمہاری قابلیت معجزہ ہے جبھی تو اس سے امپریس ہو کر میں نے تمہیں اپنے خاندان کا اہم حصہ بنا ڈالا۔''

''حسنات مجھے یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ آپ کا نام اور قابلیت اسی شان سے جاری و ساری رہنا چاہیے۔ نام کو ہمیشگی نئی نسل دیتی ہے۔ جس کا آپ نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا۔ دو سال ہونے کو آئے ہیں اب تو آپ اس طرف سوچ سکتے ہیں ناں۔'' وہ بولتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔

''بھئی یہ فلسفہ مجھے پسند نہیں آیا۔ پرانی، گھسی پٹی خواہشات ہیں سب...... پھر سے تمہیں کچھ ہونے لگا ہے، خدا کے لیے سائرہ، بھول جاؤ اس آرزو کو۔ تم اِک عام عورت نہیں ہو میری جان۔'' وہ ایک دم سے اچھل کر بیٹھ گئے۔ ''تم نے اِک خاص عورت بن کر مجھے اپنے قریب کر لیا ہے، ورنہ میں تمہاری ایبنارملٹی سے تنگ آنے لگا تھا۔ تم بہت چھوٹی لگنے لگی تھیں۔''

''اپنی زندگی کو اپنے وعدے کے ایفا کرنے سے بدلنے کی کوشش تو کریں۔ آپ کو بہت اچھا لگے گا اولاد

کا میٹھا ذائقہ...... میں اسی آس و امید میں ہی تو خاص الخاص ہو گئی ہوں، حسنات ہم بہت ڈل ہو گئے ہیں، گھر میں رونق، گہما گہمی اور شور شرابا ہونا چاہیے جو دل و دماغ کو ترو تازہ کر دے گا۔ ذہن کی تمام بند راہیں پھر سے کھل جائیں گی، یہ جمود اور سکوت و یکسانیت ختم ہو جائے گی تو میں خوشی خوشی اپنی تعلیم بھی پھر سے جاری رکھ سکوں گی۔ آپ بخوبی جانتے تو ہیں کہ تعلیم کے حصول کے لیے پیس آف مائنڈ پہلا فارمولا ہے...... اگر اسے بھلا دیا تو پھر ہم بہت جلد حسرت و یاس میں ڈوبے ہوئے موت کے منتظر پائے جائیں گے اور آپ کی تمام جائیداد اور دولت آپ کی نسل کے بجائے دوسروں کی اولاد کے کام آئے گی۔'' وہ سردیوں کی دبی ہوئی بارشوں کی طرح رونے لگی۔

آج سائرہ کی زبان سے اپنے عہد کی بازگشت سن کر ششدر ہو کر اسے دیکھنے لگے کہ وہ ان کے وعدے کو بھولی نہیں۔ بیماری کے باوجود یادداشت کمزور نہیں ہوئی۔

''سائرہ بیگم تم جانتی ہو کہ میں پچھلے سال سے دس گنا زیادہ مصروف ہو گیا ہوں۔ اور اب میری مصروفیت میں روز بروز اضافہ ہونے کے امکانات خاصے روشن ہیں۔ سائرہ یہی تو میری کامیابی ہے اور میرے دل کے ارمان پورے ہونے کے دن ہیں۔ تم مجھے ان فضولیات میں الجھانے کی کوشش مت کرو، اچھی فرمانبردار اور تابعدار بیوی وہ ہوتی ہے جو ہر حال میں شوہر کے ساتھ تعاون کرے اور ایک پیار اور عزت کرنے والا شوہر وہ ہوتا ہے جو بیوی کی خامیوں کو درگزر کر کے اس کے ساتھ نبھا کرنے میں کسی قسم کی جھنجلاہٹ محسوس نہ کرے۔ میں نے تمہیں کتنی بار ریکوئسٹ کی کہ پی ایچ ڈی کر لو مگر تم نے ہر بار اپنی ہی منطق پیش کر ڈالی۔ میں نے خاموشی اختیار کرنے میں مصلحت جانی۔ اب تم پر یہ فرض لاگو آتا ہے کہ مجھے وعدے یاد دلانے کی کوشش سے باز رہو۔ وعدے اور ضابطے و قانون تو توڑنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ بھول جاؤ سب...... جہاں زندگی کے پانچ سال اس مصیبت و وبال کے بغیر گزر گئے ہیں۔ وہاں چند سال اور سہی، سائرہ بانو اپنی آزاد زندگی انجوائے کرو، خوش رہو اور اپنے شوہر کو بھی خوش رکھو۔ خواہ مخواہ ہی تمہارے دماغ کا کیڑا تمہیں پھر سے اکسانے لگا ہے۔ اپنا اور میرا سکون غارت مت کرو۔ تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ میرے پاس بیمار ہونے کا بھی وقت نہیں سوچ لو۔'' وہ مسلسل نان اسٹاپ بولے جا رہے تھے۔

''حسنات اب سن لیں کہ میں آپ کی کھوٹی نیت، کچے ارادوں سے بخوبی واقف تھی، آپ نے تو اپنے وعدے کی پاسداری ہی نہ کی مگر میں آپ کے وعدے کی قوت پر ماں بننے والی ہوں۔ یہ مژدہ جانفزا آپ کو سنا کر یا دہانی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی داد وصول کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ بے باکی اور تیزی سے بولی تو حسنات حق دق اسے دیکھنے لگے۔ چند ثانیے کمرے میں خاموشی نے ڈیرے جمائے اور پھر اِک طوفان برپا ہو گیا۔

''میری اجازت کے بغیر...... مجھے بتائے بغیر، اتنا بڑا فیصلہ کرنے والی تم کون ہوتی ہو، مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ اپنی جان کو تم نے پھر سے نئی آزمائش میں ڈال لیا ہے، پچھلا ایپی سوڈ تم بھول گئی ہو؟ تم مرتے مرتے بچی تھیں، کاش تمہیں میں نے مرنے دیا ہوتا تو آج تم اتنا بڑا دھوکا نہ دے پاتیں۔ خیر اب وہی پروسیجر تو دُہرانا ہی پڑے گا۔'' وہ سخت برہمی سے بولے۔

''آپ کا خیال ہے کہ میں نے شجرِ ممنوعہ کا پھل تناول کیا ہے اور مجھے جنت سے نکال دیا جائے گا؟ اس دفعہ میں اس ٹائم پیریڈ سے بخیر و عافیت نکل چکی ہوں کوئی لیڈی ڈاکٹر اب مجھے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ میں نے گستاخی اور غلطی کا ارتکاب نہیں کیا۔ فیصلہ خالصتاً خدا کی طرف سے ہے۔ اب اسے نہیں

بدلوں گی۔“

”میں اسے اپنا بچہ ماننے سے انکار کرتا ہوں۔“ انہوں نے الزام تراشیوں کی انتہا کردی۔ اشتعال سے آواز اتنی بلند تھی جیسے کمرے کی چھت اڑنے والی ہو۔ ”یہ ہے تمہاری اصلیت۔ بڑی نیک پروین ہونے کا دعویٰ کرتی ہو، سب بکواس اور ڈراما تھا۔“ اسے لگا کمرے میں بادل گرجا اور پھر چند لمحوں بعد بجلی چمکی۔ جس نے آنکھیں چندھیا دی ہوں۔

”بی ہیو یور سیلف......“ سائرہ نے بہ مشکل اٹھ کر ان کا گریبان پکڑ لیا۔

”شوہرِ نامدار صاحب، آپ خدا نہیں ہیں۔ آپ لگالیں ایڑی چوٹی کا زور اور کردیں مجھے آزاد، میں آپ جیسے ناشکرے انسان کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی۔ اب یہ بچہ اس دنیا میں آکر ہی رہے گا۔ اور یہ بچہ آپ کا ہے، اسی وقت اسپتال چلیں، ڈی این اے ٹیسٹ کرواتے ہیں کیونکہ آپ کا یہ شک اور وہم دور ہونا بہت ضروری ہے۔ میں جاہل، بے بس عورت نہیں ہوں کہ اس تہمت کو سینے میں دفن کردوں گی۔“ حسنات نے اپنے ہونٹ صاف کیے جو غصے میں جھاگ اگل رہے تھے اور پاؤں پٹختے ہوئے اسٹڈی کی طرف بڑھ گئے۔ غصے اور خفگی میں زبان سے نکلے ہوئے تہمت زدہ کلمات پر ندامت تو نہ ہوئی لیکن سائرہ کے ایک فقرے نے بولتی بند کردی تھی۔

اگلے دن کی شروعات بے حد بے یقینی اور مایوسی میں ہوئی...... حسنات نے اپنے مابین اس سے فاصلہ قائم رکھنے کا تہیہ کرلیا۔ انہوں نے ملازمین کو جو ہدایات دی تھیں وہ ایسی غیر متوقع تھیں کہ پل بھر کے لیے سائرہ پر پچھتاوؤں کی بھرمار ہونے لگی۔ وہ بلک، بلک کر دہائی دینے لگی۔ حسنات اک چٹان بن چکے تھے۔ اپنی جگہ سے ایک انچ بھر نہ ہلے۔ سائرہ نے توہین و تذلیل کو برداشت کرتے ہوئے ملازمین کے ساتھ مل کر اپنا تمام ذاتی سامان گھر کے عقبی ایک وسیع بیڈروم میں شفٹ کرلیا پر وجود میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ازدواجی زندگی کے محاذ پر اس قدر ناکامی و شکست نے اس کے انگ، انگ کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

چار مہینے سائرہ نے بچے کو خوش آمدید کہنے کی تیاری [illegible] صرف کردیے۔ بچے کا کمرا وہی تھا جو ماں کا تھا۔ وہ خوشی، خوشی لاڈ پیار اور چاؤ سے کمرے کو سجا رہی تھی۔ جس کی حسنات کو خبر تک نہیں تھی۔ ان کا آمنا سامنا بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ کس حال میں تھی؟ اس کی طبیعت کیسی رہتی تھی۔ انہیں ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

سائرہ پُرامید تھی کہ بچہ آنے پر حسنات کا تمام غصہ اور ناراضی جھاگ کے مانند بیٹھ جائے گی اور آخرکار یہی بچہ ان کی ازدواجی زندگی کو بحال کرکے مسرتیں اور راحتیں بھر دے گا۔ ڈلیوری کے لیے اس کی ماں اور بھائی اسے لینے آئیں تو حسنات نے اپنی ناراضی اور مخالفت کی انہیں بھنک تک نہ پڑنے دی۔ سائرہ کو خوشی، خوشی ان کے ساتھ رخصت کرکے انہوں نے جو پہلا کام کیا کہ سائرہ کے کمرے سے بچے کی تمام چیزیں اٹھوا کر بے دردی سے گیراج میں پھنکوا دیں۔ ان کے سفلے پن اور خبیث پنے کی انتہا تھی۔

وہ کتاب پر نظریں جمائے بیٹھے تھے مگر سوچ سائرہ کے اردگرد گھوم رہی تھی۔ جس میں بھڑکتے شعلوں جیسی تپش اور جلن تھی۔ جو پل بھر کو چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ سائرہ نے منہ پر ایسا چانٹا مارا تھا کہ ان کی تمام حسیات بیدار ہوکر ان پر تازیانے برسا رہی تھیں۔

جاری ہے

رہ گئی اور منہ میں ڈالا چمچ نکالنا بھول گئی...... وہ پُھرتی سے اٹھی اور آستین سے منہ صاف کرتی پلیٹ اٹھا کر کچن میں رکھ آئی حالانکہ پلیٹ وہ ایسی صاف کر دیتی تھی کہ اگر اماں نے گلی کا موڑ مڑتا ریڑھی والا نہ دیکھا ہوتا تو وہ پلیٹ سونگھنے پر بھی انہیں خبر نہ ہو پاتی کہ اس میں کیا ڈال کر کھایا گیا ہے۔

''گیٹ کیوں کھول کے بیٹھی ہوئی تھیں تم......؟'' الگنی پہ چادر لٹکاتے ہوئے اماں نے پوچھا۔

''وہ اماں...... ساجد بھائی ابھی باہر گیا ہے تو وہی کھول کے گیا ہے شاید۔''

''تو تم اٹھ کے بند نہیں کر سکتی تھیں، کوئی زمانہ ہے اس طرح دروازے کھول کے بیٹھ جانے کا اور میں ساجد کو تمہارے پاس بٹھا کے گئی تھی اس کو ایسا کون سا ضروری کام یاد آ گیا کہ میری واپسی کا انتظار بھی نہ کیا اور تمہیں گھر میں اکیلا چھوڑ کے چلا گیا؟''

''ہونہہ......'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''مجھے اکیلا تو آپ ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں کوئی ننھی کاکی ہوں۔''

''اور میں نے تمہیں کتنا روکا ہے عظمیٰ کہ اس طرح دروازے پر ریڑھی والوں اور پھیری والوں کو نہ روکا کرو مگر تمہاری عقل میں تو کوئی بات ہی نہیں آتی۔''

''اماں...... وہ دہی بڑے کھانے کو بڑا دل کر رہا تھا...... سچی بڑے مزے کے تھے چٹ پٹے اور خوشبودار......'' ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے چٹخارا لیا تو اماں نے ناگواری سے اسے دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔

''زبان کا یہ ذرا سا چٹخارا عمر کا روگ بن جاتا ہے کبھی کبھی...... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں میری بھولی، معصوم بیٹی......'' وہ چادر تان کر وہیں لیٹ گئیں۔

☆☆☆

اگلے دن وہ دروازے کے سامنے کھڑی بڑی دیر تک ریڑھی والے کا انتظار کرتی رہی۔ بالآخر اس کا انتظار ختم ہوا۔ وہ گلی کے کونے سے آتا دکھائی دیا کئی گھروں کے سامنے اس نے ریڑھی روکی جب اس کے دروازے کے سامنے آیا تو وہ اس سے الجھ پڑی۔

''میں نے تمہیں کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ تم اپنی یہ پھٹیچر اور منحوس ریڑھی لے کر اس گلی سے نہ گزرا کرو۔ خدا جانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہو کہ تمہیں سمجھ ہی نہیں آتی میری بات۔ آج کے بعد اس گلی سے اگر گزرے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی۔ پھر ساری عمر ریڑھی چلانے کے قابل بھی نہ رہو گے۔'' وہ مسکین صورت بنائے کھڑا تھا اس قدر کھلی دھمکی پر بوکھلا کر رہ گیا پھر پپڑی زدہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''آپا میں غریب، مسکین بندہ ہوں اور آپ کو بھی مجھ سے لگتا ہے خدا واسطے کا بیر ہی ہو گیا ہے۔ میرا اور میرے گھر والوں کا رزق اس ریڑھی کے دم سے چل رہا ہے۔ سول کوارٹروں کی ان گلیوں میں میری بکری زیادہ ہوتی ہے تو میں ادھر نکل آتا ہوں۔ اس طرح تو جی ساری باجیاں مجھے اپنے بوہے کے سامنے سے گزرنے سے منع کریں گی اور میں غریب کنگال تو مارا جاؤں گا۔'' رقت زدہ لہجے میں کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔

لنڈے کی گھسی ہوئی پتلون اور شرٹ پہننے والا وہ نوجوان یقیناً کسی انتہائی غریب گھر کا لگتا تھا۔ مسکینی، عاجزی اور غریبی اس کے حلیے کے علاوہ لہجے سے بھی ٹپکتی تھی مگر رابعہ کو اس کی حالت زار کی ذرا پروا نہیں تھی بھی اکثر اس سے الجھ پڑتی لیکن وہ چپ چاپ ریڑھی گھسیٹتا آگے چل پڑتا۔ آج پہلی مرتبہ اس نے اپنے بارے میں جواباً کوئی بات کی تھی۔ سامنے والی ریحانہ کو اس پر ترس آ گیا جوان کی باتیں سن رہی تھی اس کے جانے کے بعد فوراً بولی۔

''وہ ٹھیک کہتا ہے رابعہ...... اس وچارے کے گھر کا چولھا اس ریڑھی کی بدولت ہی چل رہا ہے، باپ کی وفات کے بعد چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کا ذمہ اٹھا رکھا ہے اس نے۔ بوڑھی اور بیمار ماں سمیت سات بندے اس وہی بڑے کی ریڑھی پر پل رہے ہیں، تم خود سوچو اس کمر توڑ مہنگائی میں کیسے پل رہے ہوں گے۔''

''جیسے دوسرے لوگ پل رہے ہیں، یہاں ہر کوئی بہ مشکل ہی گزارہ کر رہا ہے۔'' رابعہ پر ریحانہ کے بیان کا مطلق اثر نہ ہوا۔ ''بس میں صرف یہ چاہتی ہوں وہ اس گلی سے نہ گزرا کرے۔''

''وہ ٹھیک کہتا ہے تمہیں اس کے ساتھ خواہ مخواہ کی دشمنی ہو گئی ہے۔ پتا نہیں کیوں وچارے کی روزی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہو۔'' ریحانہ تاسف سے بولی۔

وہ لب بھینچ گئی، کچھ بھی نہ بولی وہ اس کو کیا بتاتی کہ جب گلی کے نکڑ سے دہی بڑے لے لو کی بلند صدا اس کی سماعتوں کو چھوتی ہے تو کیسے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جلے پیر کی بلی کی طرح وہ فوراً دروازے کی جانب لپکتی ہے اور جلدی سے دروازے کی کنڈی چڑھا دیتی ہے ایسا ہر بار ہی ہوتا ہے جب وہ گلی سے گزرتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی بیٹی عظمیٰ کو دہی بڑے بہت پسند ہیں۔ وہ اکثر دہی بڑے کھانے کی فرمائش کرتی لیکن رابعہ اسے اس بری طرح ڈانٹ دیتی کہ وہ سہم جاتی پھر اکثر جب وہ دوپہر کو سونے کے لیے لیٹتی یا سوئی دھاگا نکلی، لیس یا دیگر اشیا لینے قریبی مارکیٹ تک جاتی تو عظمیٰ کو موقع مل جاتا۔ وہی بڑے کھانے کا...... وہ فٹافٹ ساجد کو بازار بھیج کر اپنے لیے دہی بڑے منگوا لیتی یا گلی سے گزرتے ریڑھی والے کو روک کر پلیٹ بھروا لیتی اور جلدی سے کھا کر اماں کے آنے سے پہلے پلیٹ دھو کر رکھ دیتی۔ اماں کو نہ جانے کیوں دہی بڑوں سے چڑ تھی بلکہ عظمیٰ کو تو یہ لگتا کہ اماں کو اس کی ہر بات سے خواہ مخواہ کی ضد ہے۔

''تم دروازے میں کھڑی کیا کر رہی تھیں؟''

اچانک اماں کی آنکھ نیند سے کھلی تھی اور دروازے پر ذرا سا کھٹکا ہونے پر وہ ننگے پاؤں بھاگی چلی آئی تھیں۔ عظمیٰ دروازہ بند کر کے پلٹی۔

''کہاں گئی تھیں تم؟'' ان کے تیور غضبناک ہوئے۔

''کہیں بھی نہیں اماں۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر اندر کی جانب بڑھی تو اماں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

''تو پھر دروازے پر کیا کر رہی تھیں تم......؟''

''اماں ساجد ابھی باہر نکلا ہے تو میں نے پیچھے سے دروازہ بند کیا ہے۔'' وہ روہانسی ہو کر وضاحت دینے لگی۔ اماں نے اس کی کلائی تو چھوڑ دی لیکن مشکوک نظروں سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اندر کمرے میں چلی گئی۔

اس کی اماں سخت مزاج اور جھگڑالو نہیں تھیں۔ بس کبھی کبھار بے جا سختی کر جاتیں وہ بھی صرف عظمیٰ کے ساتھ...... ساجد کے ساتھ ان کا رویہ محبت سے لبریز ہوتا۔

اماں نے اس پر پابندیوں کے انبار لگائے ہوئے تھے۔ کسی سہیلی کے گھر جانے پر بھی پابندی تھی۔ حتیٰ کہ دروازے سے باہر جھانکنے تک پر پابندی تھی اور چھت پر جانے کی تو سخت ممانعت تھی۔ کوئی دور، قریب کا رشتے دار بھی نہ تھا، نہ محلے کے کسی گھر میں آنا جانا۔ کبھی کبھی اس چھوٹے سے گھر میں اس کا دم گھٹنے لگتا تو وہ رو پڑتی۔ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کے علاوہ اماں کے اس سوتیلے رویے پر...... اماں نے اسے قید بنا کے رکھ دیا تھا صرف دو وقت کی روٹی اور عید بقر عید پر نیا جوڑا...... کیا صرف یہی زندگی ہے اور یہی زندگی کی ضرورتیں...... اتنی محدود زندگی، اتنی تھوڑی

ضرورتیں، وہ دل ہی دل میں اماں سے شاکی ہوتی۔

اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن اماں نے آٹھویں جماعت سے ہی اٹھالیا۔ وہ بہت روئی، منتیں کیں لیکن اماں نہ مان کے دیں۔ اس کی سہیلیاں اب میٹرک کے بعد کالج میں جاتی تھیں اور وہ زنگ آلود ٹرنک کی طرح گھر کے کونے میں ڈال دی گئی۔

شاید ابا زندہ ہوتے تو حالات مختلف ہوتے۔ ابا کی بہت دھندلی، غیر واضح سی شبیہہ اس کے ذہن کے پردے پر ثبت تھی۔

اس کے برعکس ساجد پڑھائی میں نالائق اور نکما تھا مگر اماں اسے بہت سا پڑھانا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ بہ مشکل میٹرک تک ہی جاسکا تھا، یوں اماں کے خواب ادھورے رہ گئے جن کا انہیں بہت قلق تھا اور وہ جو پڑھائی میں لائق فائق تھی مزید پڑھنے کی خواہش مند تھی۔ اس کے خوابوں پر اماں نے سختی سے پاؤں رکھ دیا اور اسے گھر کے کونے میں ڈال دیا۔ اوپر سے اماں کی شک بھری بے اعتباری نظریں جو ہر وقت اس کا بدن چھیدتی تھیں۔ اس کا دل لہولہو کرتی تھیں۔ وہ سیڑھیوں کے پاس سے گزرتی تو اماں کی سخت آواز اس کے قدموں کو زنجیر کرتی۔

''چھت پہ کیوں جارہی ہو...... چھت پر گئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گی تمہاری۔''

وہ وہیں پہلی سیڑھی پر بیٹھ کر اپنا جرم سوچنے لگتی۔ وہ بند دروازے کے آس پاس پھرتی تو عقب سے اماں پکارتیں۔

''عظمٰی کہاں جارہی ہو؟ دروازے کے پاس کیا کام ہے؟''

اس کی آنکھیں پانی، پانی ہوجاتیں اور وہ پلٹ کر پنجرے میں بند ساجد کے طوطے کے پاس بیٹھ جاتی جو باہر نکلنے کے لیے چاروں کونوں میں پھیریاں لگاتا، پنجرے کے تاروں کو چونچ مار کر اپنی ہی چونچ زخمی کرلیتا۔ اسے اپنا آپ اس طوطے کی طرح لگتا۔ مجبور بے بس قیدی...... اوپر سے اس کے بدن کے آر پار ہوتیں اماں کی شک بھری نگاہیں۔

''کیا اماں کو مجھ پر ذرا بھی بھروسا نہیں ہے؟'' وہ سوچتی رہتی اور کڑھتی رہتی۔

بالخصوص کوئی ریڑھی والا صدا لگا کے جب گلی سے گزر رہا ہوتا تو اماں کو کوئی غیر محسوس بے چینی سی لگ جاتی۔ وہ جلدی سے گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی کنڈی لگادیتیں اور پہلے سے بند دروازے کو اچھی طرح چیک کرتیں۔ عظمٰی کن انکھیوں سے ان کی ایک ایک حرکت بغور دیکھتی۔

ایک دن وہ اماں سے پوچھ بیٹھی۔

''کیا ہے اماں...... کیوں کرتی ہیں آپ اس طرح، کون سا وہم ہے جو آپ کے دل کو دہلائے رکھتا ہے؟ ایسی کون سی بے اعتباری ہے، میری ذات پر جو آپ کی نظر میں مجھے سرخرو نہیں ہونے دیتی۔ میں نے کبھی آپ کا بھروسا، آپ کا مان، آپ کا اعتبار توڑنے کی کوشش کی ہے؟ پھر آپ مجھ پر اتنی بے اعتباری کیوں کرتی ہیں؟ اتنے پہرے کیوں بٹھا رکھے ہیں؟ میں تو اماں سانس بھی آپ سے پوچھ کر لیتی ہوں۔ آپ کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی کبھی نہیں اٹھایا...... پھر آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں چھت پر اگر جاؤں گی تو باہر چھلانگ لگادوں گی...... دروازہ اگر کھولوں گی تو کسی کے ساتھ بھاگ جاؤں گی اور اگر کوئی اور نہ ملا تو اس دہی بڑے بیچنے والے کے ساتھ فرار ہوجاؤں گی، اس کی ریڑھی کا ڈنڈا تھام کر......'' وہ جو اماں کی ہتھیلیوں پر سر رکھ کے زارزار روتے ہوئے اماں کے نامناسب رویے کی وجہ پوچھ رہی تھی تڑپ اٹھی جب اماں نے ایک جھٹکے سے اس کا سر اپنے ہاتھوں سے اٹھایا اور کھینچ کے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا۔

''اگر آج کے بعد تم نے اس طرح کی بکواس کی تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گی۔'' وہ سرخ ہوتے گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے اندر جاتی اماں کو دیکھتی رہی اور آنکھوں سے نکلتا گرم پانی اس کے ہونٹوں کو چھوتا ہوا گود میں گرتا رہا۔

☆☆☆

کالے سیاہ اندھیرے نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، آسمان پر آخری تاریخوں کا مدھم چاند تھا۔ جو سیاہ رات کے آخری پہر کی تاریکی کو پوری طرح منور کرنے سے قاصر تھا اور تھکے، ماند پڑتے ٹمٹماتے ستارے بھی رات سے جدائی پر اداس تھے۔

پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ وہ اگر پوری رات نہیں سوپائی تھی تو اس کی چارپائی کے ساتھ چارپائی جوڑ کے لیٹی اس کی بیٹی بھی اس کے ساتھ جاگی تھی۔

کچھ راتیں کتنی دکھ بھری اور طویل ہوتی ہیں کہ سویرے کا انتظار کرتے، کرتے آنکھیں تھکنے لگتی ہیں۔ کیسی انکشاف بھری رات تھی اماں نے کوئی راز نہیں رکھا تھا کوئی بات بھی نہیں چھپائی تھی۔ پوری کہانی حرف، حرف سنائی دی تھی اسے، محبت کی اولین ساعتوں سے لے کر وچھوڑے کے کرب تک ہر بات لفظ بہ لفظ تکلیف دہ، ورق، ورق اذیت سے پُر۔

آج اس پر راز کھلا تھا کہ اماں کے وہم، خدشے، خوف، اندیشے اور وسوسے بے بنیاد نہ تھے ان کے پس منظر کوئی کہانی تھی۔ جسے سن کر عظمٰی بلک، بلک کر روئی اور اپنے دل پر جمی سالوں کی گرد دھو ڈالی۔ وہ ہر وقت اماں سے شاکی رہا کرتی تھی وہ سارے گلے شکوے جاتے رہے۔

''عظمٰی...... میری اماں کہا کرتی تھی کہ ماں بیٹی آپس میں سہیلیاں ہوتی ہیں اور سہیلیوں کے درمیان کوئی رازداری نہیں ہوتی اور بیٹی کو چاہیے کہ اپنی ہر بات ماں سے کہہ دے، کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رکھے، کوئی راز نہ چھپائے اور......'' اماں کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔ ''اور مجھے دیکھو میں کیسی بدنصیب بیٹی تھی اور کیسی بے وفا سہیلی تھی اپنی اماں کی...... کہ ہر بات چھپائی ان سے، دل کے سارے راز پوشیدہ رکھے، ہوا نہ لگنے دی ان کو...... پھر بے وفائی کی سزا تو ملنی تھی ناں، ماں سے بے وفائی کی سزا۔''

☆☆☆

وہ اپنی کہانی کا ایک، ایک لفظ دُہرا رہی تھی۔ زخموں سے چور چور کھرنڈ سے بے نیاز لفظ، وہ مالی کی بیٹی تھی۔ ابا کوٹھیوں اور بنگلوں میں پکا ملازم تھا ہاتھ میں صفائی اور نیک نیتی نے عزت کی چادر دے رکھی تھی۔ رابعہ سب بہن بھائیوں میں چھوٹی تھی اور گھر بھر کی لاڈلی، ابا سرِشام گھر لوٹتا تو اس کے لیے پھولوں کا گلدستہ لاتا جسے وہ اپنے سرہانے رکھ کر سویا کرتی اور رات بھر خوشبوؤں کے حصار میں رہتی۔ وہ سب کی لاڈلی تھی بھائیوں کی، بہنوں کی، ابا کی، اماں کی...... بھائی اسکول سے واپسی پر اپنے بستوں میں اس کے لیے ٹافیاں لانا نہ بھولتے، ابا پھولوں کے گلدستے کے ساتھ مٹھائی کا لفافہ لاتا جو سب میں برابر تقسیم ہوتی تو بہنیں اپنے حصے کا آدھا اس کی مٹھی میں دبا دیتیں۔ اماں کی تو وہ سہیلی تھی۔

''میری رابی تو میری پکی سہیلی ہے۔'' ماں کوئی لمحہ اس کے بغیر نہ رہ پاتی۔

پھر اس کو دہی بڑے کھانے کا چسکا لگ گیا۔ اب ابا بلاناغہ اس کے لیے دہی بڑے لانے لگے، سی، سی کرتے ہوئے وہ دہی بڑے کی پلیٹ چٹ کر جاتی، آنکھوں سے ناک سے پانی بہتا رہتا، وہ اور مرچیں ڈال کر مزید چٹ پٹے بنالیتی اور سوں، سوں کرتی کھاتی رہتی۔ اسے مزید کی طلب رہتی۔ حالانکہ ماں اس کی صحت کے خیال سے منع بھی کرتی مگر جب گلی کے نکڑ پر ریڑھی والے کی مخصوص صدا ابھرتی تو وہ بھاگتی دوڑتی مٹھی میں نوٹ دبائے

دروازے سے باہر لمبی چوٹی کمر پر لہراتی جاتی۔

"کبھی کبھار کی بات اور ہوتی ہے رابی...... ہر روز دہی بڑے نہ کھایا کر، یہ مسالے صحت کے لیے اچھے نہیں ہوتے، معدے میں جلن ہو جاتی ہے۔" اماں اس کی صحت کے لیے فکر مند ہوتی۔

"کوئی نہیں۔" وہ بے پروائی سے کہتی۔ "اماں تجھے پتا ہے مجھے دنیا میں سب سے زیادہ دہی بڑے پسند ہیں۔ میرا دل کرتا ہے، دہی بڑوں کا بڑا سا دیگچا ہو لبالب...... اور میں پیالے میں ڈالتی جاؤں کھاتی جاؤں...... ہائے مزہ آجائے قسم سے۔" اس نے زور دار چٹخارا لیا۔ اماں سمیت دونوں، بہنیں بھی اس کے بچپنے پر ہنس دیں۔

"اماں...... میرا مشورہ ہے کہ اس کے لیے کوئی دہی بڑوں کی ریڑھی لگانے والا ہی ڈھونڈنا تاکہ دہی بڑوں کا شوق تو پورا ہو اس کا، ڈالتی جائے کھاتی جائے...... رج کے کھالینا دہی بڑے۔" آپا کی ان دنوں نئی، نئی منگنی ہوئی تھی اماں کو اس کے حوالے سے آپا نے مشورہ دیا۔

"ہائے نی، کیوں خیری صلا...... میری دھی رانی کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے گا۔" اماں دلار سے بولی اور یہی وہ لمحہ تھا، ظالم اور قاتل لمحہ...... جب آپا کی مذاق میں کہی ہوئی بات اندر کہیں دل کے کسی خانے میں ترازو ہوگئی اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔

وہ کچی پکی عمر کے کچے پکے پل تھے اور آتی جوانی کی نادان رُتیں۔ بوڑھی دادی کہا کرتی تھیں کہ یہ اندھی عمر ہوتی ہے قدموں کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیتی ہے پھر بزرگ کچھ بھی نہیں کرپاتے، ٹھوکر کھائے بغیر نہیں رہ سکتے اور آدمی کو کیا خبر ہوتی ہے کہ ایک بار جو ٹھوکر لگی تو زندگی پھر ٹھوکروں کی زد میں آجاتی ہے۔

دادی یقیناً ٹھیک ہی کہتی تھیں...... کچھ غلطیوں کا کفارہ ادا کرتے کرتے عمر کی نقدی ختم ہو جاتی ہے لیکن سود پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ رابی کی الہڑ آنکھوں میں پہلا...... پہلا خواب کیا اترا کہ بدن میں سنسنیاں بھر گئیں، زبان کا چٹخارا دل پر چٹکی لگا گیا، گلی کے نکڑ پر دہی بڑے والے کی مخصوص باجے کی آواز "پاں" ہوتی تو وہ ہر کام بھول کر گلی کی طرف لپکتی، ہر کام سے ضروری یہی لگتا، چٹ پٹا سا ذائقہ پورے بدن میں سرور سا بھر دیتا۔ دہی بڑوں سے لبالب پلیٹ پکڑتے ہوئے ہاتھ پکڑانے والے ہاتھ کے ساتھ ذرا کا ذرا مس ہوتا تو اس کے جسم میں جیسے مرچیں سی لگ جاتیں۔ کانپتے ہونٹ، لرزتی پلکیں، نئی، نئی آئی جوانی کے تمام لوازمات...... کوئی انوکھا اور کرارا سا ذائقہ تھا ہر گھڑی اور ہر پل میں، ریڑھی والے ارشد کی نظر بھی اپنے کام سے ہٹ کر اس گھڑی، گھڑی دروازے سے باہر جھانکتی لڑکی پر ٹھہر گئی تھی ایسی من موہنی صورت کہ وہ کاروباری حساب کتاب بھول جاتا۔

"دہی بڑے کی ایک پلیٹ لبالب۔"

"پیسے کتنے؟" بند مٹھی کھلتی۔

"رہنے دیں، آپ سے پیسے کیا لینے۔" آنکھیں اس کا سراپا ٹٹولتے نثار ہونے لگتیں۔

"ہائے اللہ......!" اس کا دل بے ساختہ دھڑکا۔ "توبہ ایسا سخی اور پھر طرزِ تخاطب کتنا خوب صورت۔" وہ سپنوں کے کسی جہان میں کھونے لگتی۔ ریڑھی کے ہینڈل پر اس کے لانبی انگلیوں والے مضبوط ہاتھوں کو دیکھتی تو اسے دنیا کا عظیم ترین کام یہی لگتا۔ دہی بڑوں کی ریڑھی کو گلی، گلی گھسیٹنا، بڑی آپا کو اماں کا دیا جانے والا مشورہ اسے سچ ہوتا دکھائی دیتا۔

"اماں اس کے لیے کوئی دہی بڑے بیچنے والا بر ڈھونڈنا۔" اور جواباً اماں نے کہا تھا۔

"میری دھی رانی کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے

گا۔" اماں اس کی نظریں اتارتیں اور شہزادہ تو آگیا تھا خود چل کر، اس نے اپنے سامنے کھڑے پتلے اور لمبے سے ارشد کو نظر بھر کر دیکھا اور نہیں تو کیا...... اور پھر شہزادہ تو وہی ہوتا ہے جس کو دل راضی خوشی اپنی سلطنت پر بٹھا دے اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ جائے اور رابعہ اس کے قدموں میں ہی بیٹھی تھی جب اس نے کہا تھا۔

"میں تو غریب سا بندہ ہوں رابی۔"

"میں تو جیسے کوئی امیر زادی ہوں ناں۔" وہ ہنس دی، تحقیر زدہ ہنسی۔

"میرا بہت چھوٹا سا گھر ہے۔" اس نے اگلی سچائی اگلی۔

"میرا بنگلا بھی تم نے دیکھ رکھا ہے!" وہ ایک بار پھر یونہی ہنس دی، بلا جواز، بلا ضرورت کہ ان دنوں ہنسی یوں ہی بلا ضرورت آتی تھی۔

"پھر بھی رابعہ......" اس کے دل میں جانے کتنے وہم تھے مگر رابعہ بے پروائی سے اس کی سوچوں کو رفع کرتی گئی۔

"کچھ نہیں، تم دل میں کوئی وہم نہ پالو، جب میں خوش ہوں، مطمئن ہوں، مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے، باقی دنیا کی کوئی چیز نہیں۔"

کیسی سخاوت ہوتی ہے محبت کے مزاج میں کہ دنیا کی ہر شے کو ٹھکرا دو...... بس محبت کے لیے......

محبت کی اندھی پگڈنڈی پہ وہ آنکھیں بند کیے چلی جا رہی تھی جب اسے کسی سوچ کی ٹھوکر لگی۔ "کیا اماں، ابا مان جائیں گے؟"

"پہلے میری کوئی بات کبھی ٹالی ہے؟" دل اٹھلایا۔

لیکن یہ خام خیالی ثابت ہوئی ابا کو خبر ہونے سے پہلے ہی اماں نے اسے مار، مار کر نیل و نیل کر دیا تھا۔ اسے درد سے زیادہ حیرت ہوئی۔ اماں نے جو کبھی پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا اب اتنی مار...... دو اس سے بڑی بہنیں، دو بڑے بھائی، چھوٹا سا گھر بھرا تھا بن بیاہے لوگوں سے...... پھر وہ کیسے بیاہ دی جاتی...... یہ سوچ تو اسے آئی ہی نہیں تھی اب اماں نے اچھی طرح سمجھا تو دی مگر سمجھ بوجھ کہاں تھی ان دنوں۔

"میری اماں کسی صورت بھی نہیں مان رہیں تمہارے گھر رشتہ لانے کے لیے۔" اُدھر سے ارشد پریشان سا اس کے سامنے آیا اور درد میں اضافہ ہی کیا۔

"یہاں کون سا تمہارا رشتہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔" اس نے پورا دکھ بیان کیا۔

"اب کیا ہوگا ارشد......؟" اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی ارشد۔" اس نے سچی بات بتائی۔

"ہوں......" ارشد کے ماتھے پر کسی گہری سوچ کی لکیر ابھری۔

پھر...... اندھی عمر کا اندھا فیصلہ کرتے ہوئے وہ ذرا نہ ڈگمگائی، اس کا دل ذرا نہ کانپا، اپنے جان سے پیارے رشتوں کو چھوڑتے ہوئے، اپنے باپ کی عزت کو قدموں تلے روندتے ہوئے۔ اپنی ماں کے اعتبار کو تار، تار کرتے ہوئے...... اپنے گھر کو اپنی جنت کو چھوڑتے ہوئے اور لڑکیاں جب جان بوجھ کر اپنی جنت کو چھوڑ دیتی ہیں تو سیدھی دوزخ میں جا گرتی ہیں۔

گھروں سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کو کیا ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ماں، باپ کا خیال نہیں آتا کیا......؟ زبان کی نوک پر دہی بڑوں کا محسوس کیے جانے والا صرف چند لمحوں کا چٹ پٹا سا ذائقہ اس سے اتنا بڑا فیصلہ کرا گیا کہ وہ راتوں رات گھر سے بھاگ گئی...... اس نے مڑ کر نہ دیکھا کہ اس کی ماں کیسے، کیسے بین کر رہی ہے، اس کی بہنیں ایسے روئیں جیسے کوئی کسی کے مرنے پر روتا ہے، اس کا

محنتی اور ایماندار باپ اپنی غلطیاں اپنے گناہ شمار کرتا رہا...... اور اس کے بھائی بے غیرتی کی چادر تان گئے۔ جو لڑکیاں، ماں، باپ کی عزت و آبرو کو رات کی تاریکی میں رولی کے گھر کی دہلیز پار کر جاتی ہیں ان کو پھر زندگی میں کہیں عزت نہیں ملتی۔ ارشد کی ماں نے اسے بہو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیاں بہویں نہیں ہوتیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اسے بددعائیں دیتی...... اور بددعاؤں کی بنیاد پر بننے والے گھر تو نمک کے مکان ہوتے ہیں۔ قطرہ، قطرہ آنسو سے ٹوٹ جانے والے، اس نے جان لڑا دی، گھر نہ ٹوٹے کہ اپنے پیچھے تو وہ اپنے ہاتھوں سے دروازہ بند کر آئی تھی۔

ساس کی نگاہ میں وہ کھٹکتی رہتی۔ اس کا ہر عمل ناقابلِ قبول ہوتا، اسے ہر، ہر جگہ پر گھر سے بھاگی ہوئی، بے حیا لڑکی کا طعنہ ملتا، وہ کان لپیٹ لیتی، ہونٹ سی لیتی...... دل روتا رہتا، بدن دکھتا رہتا، جب ارشد ذرا، ذرا سی بات پر روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ وہ نیل و نیل بدن پر ٹکوریں کرتی رہتی۔ اس کے کہیں بھی آنے جانے پر پابندی تھی، بننے سنورنے کی ممانعت تھی، اس کی محبت نے تو بدلے میں گویا اسے عمر قید با مشقت سنا دی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا، کوئی تھکن سی پورے بدن میں پھیلتی پوروں کو چھونے لگتی۔ وہ چھت پر دو گھڑی کے لیے کھلی ہوا میں سانس لینے جاتی تو ارشد کی دہاڑ اسے سہا دیتی۔

''چھت پر کسے دیکھنے جاتی ہو تم روز روز...... کوئی اور ریڑھی والا پھانسنے کا ارادہ ہے، وہی بڑوں سے اور وہی بڑے بیچنے والے سے دل بھر گیا ہے کیا......؟'' وہ چوٹی سے پکڑ لیتا اور بڑی زور کی مار مارتا۔ وہ بے اعتبار عورت تھی پھر وہ اعتبار کیسے کرتا بھلا......!

وہ چپ چاپ ویران و بیابان آنکھوں سے اپنے محبوب کو دیکھے جاتی۔

دیواروں میں چنے، چُنے سال صدیاں ہو کر گزرنے لگے، پہلے ساجد زندگی میں آیا پھر عظمٰی چلی آئی، ٹھیک کہتے ہیں لوگ بچے جینے کا سہارا ہوتے ہیں وہ بھی دونوں بچوں کی آس میں جینے لگی۔

ایک دن نہ جانے اس کے جی میں کیا سمائی وہ ان جانی پہچانی گلیوں میں چلی آئی جہاں ابا کی انگلی پکڑ کر کتنی بے فکری سے گھوما کرتی تھی، بچپن سے لڑکپن اور جوانی تو ابھی آدھی پونی ہی آئی تھی کہ اس نے وہ گلیاں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔ اس لمحے اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رو دیا جب خبر ملی کہ وہ لوگ تو بڑا عرصہ ہوا کہ یہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ ابا کو کتنی محبت تھی اس محلے سے، اس گھر سے جس کی ایک، ایک اینٹ میں گارے کی جگہ ابا کا پسینہ لگا تھا۔

کیا بیٹیاں اس لیے ہوتی ہیں کہ والدین کو زمانے بھر میں رسوا کر کے در بدر کر دیں......؟ اور شاید اسی خوف کے پیشِ نظر لوگ بیٹیوں کی پیدائش پہ دھاڑیں مار کے روتے ہیں۔

''کاش! میں پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔'' اس کا دل اپنے ہی لہو میں ڈوبا، وہ دیر تک روتی رہی جیسے کوئی کسی کے مر جانے پر روتا ہے، اتنا تو وہ پھر زندگی بھر نہیں روئی تھی ارشد کے ایکسیڈنٹ کے بعد دس دن کوما میں رہنے کے بعد مر جانے پر بھی نہیں...... بس وہ آنسوؤں سے بے نیاز خشک آنکھوں سے کورے کفن میں لپٹے اس شخص کو دیکھتی رہی جس کے پیچھے، پیچھے چلتے، چلتے وہ اپنی جنت چھوڑ آئی تھی۔ جس کے لیے اس نے خود سے وابستہ اپنے پیاروں کو کھویا تھا اور خود کو بے سکون کر لیا تھا ہمیشہ کے لیے...... ماں، باپ کو دکھ دے کر کون سکون سے رہا ہے بھلا......؟

ارشد کی موت کے بعد وہ ایک کپڑے کی فیکٹری میں ملازمت کرنے لگی۔ چنانچہ گھر کا چولھا ٹھنڈا ہونے سے محفوظ رہا۔ اس کی ساس جوان بیٹے کی موت کا صدمہ سہار نہ سکی اور چند ماہ کے اندر ہی ...... چٹ پٹ ہو گئی۔

جن لوگوں کا جینا دوسروں کے لیے اذیت کا باعث ہوتا ہے، ان کے مر جانے سے زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اب اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ساجد کو تعلیم یافتہ بنا کے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا تھا مگر ساجد بھی ارشد کا بیٹا تھا۔ بہ مشکل میٹرک تک گیا اور میٹرک میں بری طرح فیل ہونے کے بعد مزید پڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لیے بھیجنے لگی کہ فارغ رہ کر کسی غلط صحبت میں نہ پڑ جائے۔ عظمٰی اگرچہ پڑھائی میں لائق تھی اسے پڑھنے کا شوق بھی تھا لیکن مڈل کے بعد اس نے اسے مزید پڑھنے سے روک دیا۔ اور خود فیکٹری کی نوکری چھوڑ کر گھر میں ہی سلائی کا کام کرنے لگی...... اور اب سارا دن بیٹی کی نگرانی میں گزار دیتی، اس کے پل، پل کی خبر گیری کرتی، لمحے، لمحے کا حساب مانگتی...... وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے ذرا سی چوک ہو اور اس کی بیٹی چور رستے تلاش کر کے ان راہوں کی مسافر بنے جن ...... پر چل کر اس نے اپنے قدم آبلہ پا کیے تھے۔

لیکن آج اس کی بیٹی نے اسے کیسا آئینہ دکھایا تھا کہ وہ گہرے صدمے میں تھی۔ اس کی بیٹی نے ٹھیک سمجھا تھا، واقعی یہ خوف اس کے دل کے ساتھ کسی ...... ہمزاد کی طرح چمٹا ہوا تھا کہ وہ اگر ذرا سی بھی چوک گئی تو اس کی بیٹی گھر کی دہلیز پار کر جائے گی...... وہ اس کی رکھوالی کر رہی تھی کیونکہ اسے اپنی ماں سے ہمیشہ یہی شکوہ رہا کہ ماں نے اس کی اچھی طرح رکھوالی نہیں کی...... ایک ماں ہونے کے ناتے اسے پتا ہونا چاہیے تھا کہ اس کی بیٹی غلط رستوں پر چل نکلی ہے۔ مائیں تو بیٹیوں کے چال ڈھال اور رنگ ڈھنگ

پہچان کر خطرے کی بُو پا لیتی ہیں۔ گھر میں بیٹیاں جوان ہوں تو مائیں سونا بھول جاتی ہیں، وہ کیسی ماں تھی......! اس نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی۔

''شاید میری ماں کو مجھ پر بھروسا تھا کہ وہ غافل ہو گئی...... اور میں نے اس کے بھروسے کو، مان کو، اعتبار کو راتوں رات مٹی میں ملا دیا۔'' کوئی گلیشیر تھا جو پگھلا تو آنکھوں کو پانی، پانی کر گیا۔

''میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ بیٹیاں تو مان ہوتی ہیں، بھرم ہوتی ہیں، عزت و آبرو ہوتی ہیں، رشتوں کا، نسلوں کا، خاندانوں کا...... اور بیٹیوں پر تو بڑی بھاری ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ یہ بھرم نہ توڑیں۔ میری ماں سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ محبت کے ساتھ مجھ پر اعتبار کرتی رہی مگر رکھوالی کرنا بھول گئی۔ اگر غلطی میری ماں سے ہوئی تھی تو صحیح میں بھی نہیں کر رہی، ورنہ میری بیٹی مجھ سے اس طرح شاکی نہ رہتی۔ میں رکھوالی تو کر رہی ہوں مگر بے اعتباری کے ساتھ...... اس طرح تو میں انجانے میں اسے بغاوت کی راہ دکھا رہی ہوں...... میری بیٹی کہتی ہے کہ اماں مجھ پر اعتبار کر کے دیکھو تو......'' اس نے آسمان کے کناروں سے پھوٹتی صبح کی سفیدی کو دیکھا مقدس اور پاکیزہ...... اندھیرے کا نام و نشان بھی نہیں تھا، ایک نیا سورج طلوع ہونے کو تھا۔

آنسو صاف کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک نئے عزم کے ساتھ...... اللہ سے استقامت مانگتے ہوئے وہ پُرسکون تھی۔ اسے اپنی بیٹی کی سہیلی بننا تھا اور نگران بھی...... اور اسے یقینِ کامل تھا کہ اس کی بیٹی اس کا مان نہیں توڑے گی...... یہ ضروری تو نہیں کہ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوں۔ اس نے اٹھ کر پرانے بکسے کا ڈھکن کھولا جس میں عظمٰی کی کتابیں رکھی تھیں جن پر اب سورج کی پہلی کرن پڑ رہی تھی گویا روشنی دور نہیں تھی۔

